شخصیات

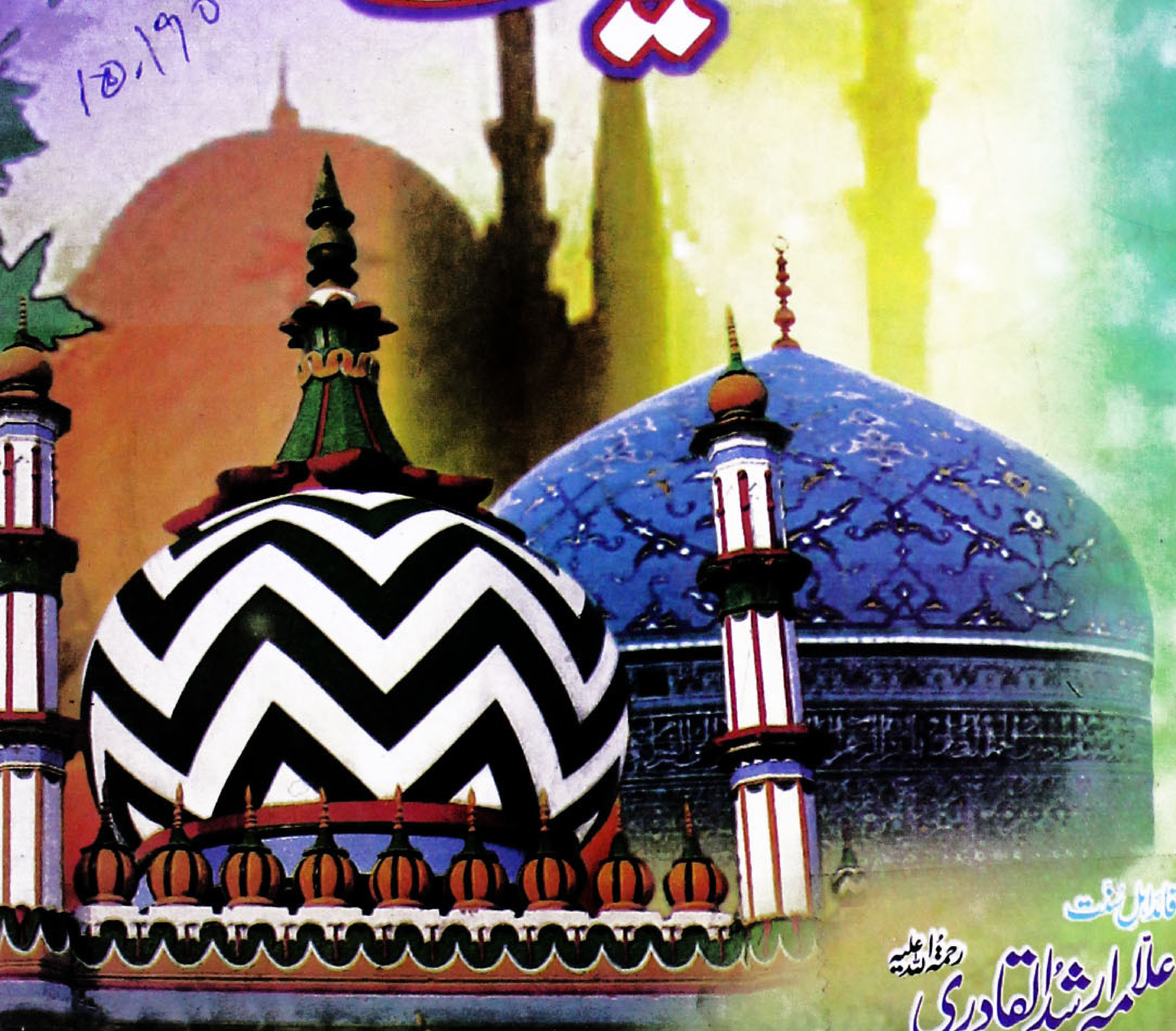

10,195

قائد اہل سنت
علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور ۔ کراچی ○ پاکستان

شخصیات

قائدِ اہلِ سُنّت

علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	شخصیات
مصنف	قائد اہلسنّت علامہ ارشد القادری رحمہ اللہ
ترتیب وتقدیم	ڈاکٹر غلام زرقانی 84943
تاریخ اشاعت	دسمبر 2007ء
ناشر	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	MT23
قیمت	175 [redacted] - روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953 فیکس:۔ 042-7238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون: 021-2212011-2630411۔ فیکس:۔ 021-2210212

e-mail:- sales@zia-ul-quran.com

zquran@brain.net.pk

Visit our website:- www.zia-ul-quran.com

میں ادارہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، پاکستان کو جملہ حقوق برائے اشاعت ''شخصیات'' تفویض کرتا ہوں اس کے علاوہ پاکستان میں کسی ادارہ یا پبلشرز کو یہ کتاب چھاپنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ (ڈاکٹر غلام زرقانی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ

ونصلی علی رسولہ الکریم

وعلی آلہ

وصحبہ اجمعین

شخصیات

شرف انتساب

غوث اعظم

محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ العزیز

کے نام

جن کی خداداد شوکت واقتدار کا دائرہ زمین کی وسعتوں تک پھیلا ہوا ہے۔

دعا جو

غلام زرقانی

مشمولات

افتتاحیہ: ڈاکٹر غلام زرقانی کے قلم سے ۱

تأثرات : پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد ۵

پہلی شخصیت: غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی

جیلان کا تاجدار ۹

نقیبوں کی آواز ۱۰

امام حسن عسکری کی بشارت ۱۱

حضرت جنید بغدادی کی بشارت ۱۱

بلخ کے شیخ اعظم کی بشارت ۱۱

شیخ ابو بکر بطائحی کی بشارت ۱۲

خواب میں رسول الثقلین کی تشریف آوری ۱۲

حرم سرائے شوق کی کہانی ۱۳

غوثیت کبری کے نقوش ۱۶

دوسری شخصیت : سلطان الهند خواجه غریب نواز

خواجۂ خواجگاں ۲۱

چشتی کہلانے کی وجہ ۲۱

نسب نامہ ۲۲

عہد طفلی کا ایک رقت انگیز واقعہ ۲۲
تعلیم وتربیت ۲۳
خراسان سے ہندوستان تک کا طویل سفر ۲۳
مرشد سے ملاقات ۲۴
حرمین طیبین کی حاضری ۲۶
خرقۂ خلافت ۲۷
ایام سفر کے عجائب وغرائب ۲۷
حضرت خواجہ کا مسلک ۳۲
اجمیر میں ورود مسعود اور فتح اجمیر ۳۲
شہاب الدین غوری ہند کی طرف ۳۴
وصال شریف ۳۵
پسماندگان ۳۶
دلوں کا مرکز عشق ۳۶
شہزادی جہاں آراء بیگم کی حاضری ۳۷
تیسری شخصیت :احسن العلماء سید مصطفٰی حیدر میاں
شبستان علم ورحانیت کی شمع فروزاں ۴۱
چوتھی شخصیت :مفتی اعظم ہند علامہ مصطفٰے رضا خاں
مفتی اعظم ہند ایک عہد ساز شخصیت ۴۹
سفر آخرت کا آنکھوں دیکھا حال ۵۶
غسل کے وقت کرامت کا ظہور ۵۹
مرض الموت کے عجیب وغریب واقعات ۶۰

پانچویں شخصیت :صدر الشریعہ علامہ محمد امجد علی
شہید حجاز ۶۳
چھٹی شخصیت: غزالئ دوراں علامہ احمد سعید کاظمی
ایک عبقری شخصیت ۷۷
ساتویں شخصیت :قطب مدینہ ضیاء الدین احمد مدنی
قطب مدینہ کا سفر آخرت ۸۷
آٹھویں شخصیت :حافظ ملت علامہ عبدالعزیز مرادآبادی
ایک شخصیت ساز استاذ ۹۷
حافظ ملت کے عشق مبین کی فتح ۱۰۳
حافظ ملت اور تحریک اشرفیہ ۱۰۷
حافظ ملت اور احیاء دین کی تحریک ۱۱۱
نویں شخصیت :محسن ملت علامہ حامد علی فاروقی
محسن ملت جدوجهد کی ایک تاریخ ۱۲۸
دسویں شخصیت :شیخ المشائخ شاہ محمد تیغ علی
حیات شیخ المشائخ ۱۳۹
دیدۂ شوق کو دعوت نظارہ ۱۳۹
سلسلۂ طریقت ۱۴۲
عہد طفلی ۱۴۳
مجذوب سے ملاقات اور زمانۂ تعلیم کا واقعہ ۱۴۴
منزل کی طرف پہلا قدم ۱۴۵
باطنی دنیا میں جشن مسرت ۱۴۷

روحانی ترقیوں کا زمانہ ۱۴۸
حیرت انگیز مجاہدہ ۱۴۹
مسند خلافت وارشاد پر جلوہ گری ۱۵۰
کشور قلوب میں ولایت کا غلغلہ ۱۵۱
شیخ المشائخ کا مسلک ۱۵۲
سرکانہی شریف میں ایک دارالعلوم کا قیام ۱۵۳
کشف وکرامات ۱۵۴
ملفوظات ۱۵۹
خصائص وشمائل ۱۶۲
آخری لمحات ۱۶۴
سجادہ نشیں ۱۶۷
خلفاء ۱۶۷

گیارھویں شخصیت:

شیر بیشۂ اہل سنت علامہ حشمت علی

ایک پیکر وفا ۱۷۱

بارھویں شخصیت :مجاھد ملت علامہ حبیب الرحمن

ایک عہد ساز شخصیت ۱۷۹

افتتاحیہ

بزم ''شخصیات'' میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہوئے میرے فرحت وانبساط کا عجیب عالم ہے......عالم تصورات میں خود کو......کبھی اقلیم ولایت کے تاجداروں کی چوکھٹ پر سجود نیاز لٹاتا ہوا دیکھتا ہوں......کبھی علم وحکمت کے آفتاب وماہتاب کی بارگاہ میں زانوئے تلمذ تہہ کرتا ہوا......کبھی خداداد شوکت واقتدار کے حاملین درویشوں کے پائے ناز سے لپٹا ہوا......پھر والد گرامی قائد اہل سنت حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی عبقری شخصیت اور یکتائے روزگار طرز تحریر کا خیال......اور پھر اپنے سراپائے ناچیز کی تصویر جوں ہی پردۂ تخیلات پر مرتسم ہوتی ہے، وفور جذبات کے تلاطم میں پلکوں کا دامن بھیگ جاتا ہے کہ یہ ''عمل جلیل'' اور وہ بھی میرے ہاتھوں سے۔

یہ بلاشبہ کارسازیٔ قدرت کا فیضان عظیم ہے کہ فرماں روائے قرطاس و قلم کے ان بکھرے ہوئے مضامین کو یکجا کرنے کی سعادت مجھ بے بضاعت کے حصہ میں آئی جن کا تعلق ......خاصان خدا سے ہے ......علمائے ربانین سے ہے ......فقہائے کرام سے ہے......فعال و متحرک قائدین ملت اسلامیہ سے ہے.....اور معمار قوم و ملت سے ہے۔

یاد'' رفتگاں'' کی شعاؤں سے اپنی محفلوں میں زندگی کا اجالا بکھیرنا فطرت انسانی کا تقاضا ہے۔ بلاتفریق مذہب و ملت ہر دور میں جاں نثاروں نے اپنے ممدوحین کی بارگاہ میں عقیدت و محبت کا خراج پیش کیا ہے۔ تاریخ انسانیت کا مطالعہ کرنے والا یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہر قوم اپنے اسلاف سے آنے والی نسلوں کو روشناس کرانے کے لیے اپنی قومی تاریخ مرتب کرتی ہے تاکہ موروثی روایات کے تحفظ و بقا کو یقینی بنایا جاسکے۔

ذرا سوچیے تو سہی! انسانیت دشمن عناصر دنیا میں مخرب اخلاق تہذیب و تمدن کی تشہیر کے لیے اپنے اسلاف کو یاد رکھیں اور ہم ان روحانی، علمی، دینی اور تقدس مآب شخصیات کو فراموش کر دیں؟.............جن کی یادیں ظلمت و تاریکی میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کو ہدایت کے نور آشنا کرتی ہیں.............خود فراموشی کے غربت زدہ ماحول میں واہب لایزال کے تصورات سے دل بستگی کا سامان فراہم کرتی ہیں ....دنیاوی عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے ناعاقبت اندیشوں کو روحانی کیف و سرور کے جام سے سیراب کرتی ہیں.......مادی منفعت کی خاطر کمزوروں کا خون چوسنے والے سرکشوں کے دلوں میں خدمت انسانیت کا جذبہ مسیحائی بیدار کرتی ہیں ....اور انسانی آبادیوں میں رواداری، بھائی چارگی، پیار و محبت، ادب واحترام، شفقت والتفات، حسن سلوک، اصلاح نفس، تزکیہ باطن اور تواضع وانکساری کے جذبات پیدا کر کے انہیں پھر سے صراط مستقیم پر گامزن ہونے میں معاون و مددگار رہتی ہیں۔

بہت ممکن ہے کہ یہی وہ داعیہ ہو جس کی رفاقت میں قائد اہل سنت علیہ الرحمہ

نے تاریخ اسلامی کی چند معزز ترین اور عہد ساز شخصیات کی بارگاہ میں اپنی خوش عقیدگی کا خراج پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ قائد اہل سنت علیہ الرحمہ متاثر تو کئی اسلاف کرام سے تھے، لیکن بے پایاں جماعتی ذمہ داریوں کی وجہ سے چاہتے ہوئے بھی بہتوں کی خدمت میں قلمی نذرانۂ محبت نہ پیش کر سکے۔ مثال کے طور پر رئیس المناظرین مجاہد ملت حضرت علامہ حبیب الرحمٰن علیہ الرحمہ کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ

''...... یہ بالکل امر واقعہ ہے کہ مناظرہ کے اصول ورموز، بحث واستدلال کے ضابطے اور گفتگو کے قواعد وآداب کا جو سرمایہ بھی میرے پاس ہے، وہ حضور مجاہد ملت ہی کا عطا کردہ ہے۔''

اور خواہش بھی رہی کہ مجاہد ملت علیہ الرحمہ کی تاریخ ساز شخصیت کے حوالے سے اپنے احساسات کو قلمبند کریں جیسا کہ فرماتے ہیں؛

''......فی الحال اس نمبر کے ذریعہ عامہ مسلمین اہل سنت تک یہ پیغام ضرور پہنچادینا چاہتا ہوں کہ اگر اللہ نے چاہا تو مستقبل قریب میں حضرت مجاہد ملت علیہ الرحمہ کی مبارک زندگی کے اس گوشے پر ایک طویل مضمون یقیناً شائع کروں گا۔''

(نوائے حبیب کلکتہ، مجاہد ملت نمبر، ۱۹۸۶ء، ص:۱۰)

بہر حال یہ چند تذکرے گو کہ ضخامت میں کسی قدر کم ہیں لیکن کیف کے اعتبار سے ان کا مقام بہت بلند ہے کہ ایک دیدہ ور نقاد، عہد شناس مصنف اور ہمہ جہت شخصیت نے اپنے قلبی واردات سے ہمیں روشناس کرانے کی سعی جمیل کی ہے۔ اس میں بعض ایسے ہیں جو جام نور کلکتہ، رفاقت پٹنہ، اہل سنت کی آواز دہلی، محسن ملت رائے پور، اشرفیہ مبارکپور اور شان ملت پٹنہ کے شماروں میں شائع ہو چکے ہیں، لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو اب تک مخطوطہ کی شکل میں تھے اور پہلی بار نظر قارئین ہو رہے ہیں۔

بزم ''شخصیات'' کے مشمولہ مضامین کی حصولیابی میں جن احباب نے تعاون فرمایا ان سب کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں، جن میں جناب پروفیسر سید مجتبیٰ احمد مارہروی جناب مفتی وفاء المصطفیٰ صاحب، محترمی جناب مولانا محمد علی فاروقی صاحب، محترم ڈاکٹر شکیل اعظمی صاحب، علامہ فداء المصطفیٰ اعظمی اور فخر صحافت مولانا مبارک حسین مصباحی کے اسماء گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح اپنی اہلیہ کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں ہر ممکن تعاون کیا۔

خدائے عز و جل سبھوں کو دونوں جہان کی برکتوں سے نوازے۔

خیر اندیش

غلام زرقانی قادری

(جانشین قائد اہل سنت علیہ الرحمہ)

ہیوسٹن، ۱ر فروری ۲۰۰۷ء

تأثرات

ماہر رضویات پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب

(ایم اے، پی ایچ ڈی، اعزاز فضیلت)

حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ سے ان کی تصانیف کے ذریعہ تعارف تو پہلے ہی سے تھا اور فقیر بھی اپنی تصانیف کی وجہ سے پہلے سے متعارف تھا، مگر جب ۱۹۷۹ء میں مولانا حسن رضا خان نے امام احمد رضا محدث بریلوی علیہ الرحمہ پر بہار یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کرنا چاہا تو حضرت علامہ علیہ الرحمہ نے علمی تعاون کے لیے پہلا مکتوب شریف ارسال فرمایا، پھر تعارف کا یہ سلسلہ غائبانہ سے بالمشافہ ہوگیا۔ غالبا پہلی ملاقات دارالعلوم امجدیہ کراچی میں ہوئی جب وہ ''دعوت اسلامی'' کے لیے خلوت میں لائحۂ عمل تیار کررہے تھے تو فقیر کو بھی اس میں شریک کرلیا...... پھر دوسری ملاقات ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کراچی میں ہوئی...... تیسری ملاقات امام احمد رضا انٹرنیشنل کانفرنس کراچی میں ہوئی...... پھر چوتھی ملاقات غریب خانے پر ہوئی جب فقیر نے ان کو مدعو کیا...... پھر پانچویں ملاقات مکتبہ جام نور دہلی میں ہوئی جب فقیر کی علامہ علیہ الرحمہ نے

دعوت کی ....اور پھر آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب انہوں نے جامعہ حضرت نظام الدین نئی دہلی کے معائنہ کے لیے یاد فرمایا۔

علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ سراپا حرکت تھے اور لگن کے پکے۔ سخت سے سخت بیماری بھی ان کی راہ عمل میں حارج نہ ہوئی۔ کراچی کے زمانہ قیام میں بار بار بے ہوش ہوتے اور کئی کئی گھنٹے بے ہوش رہتے، لیکن جب ہوش آتا تو کام میں لگ جاتے........وہ جوانان اہل سنت کے لیے بے مثال عملی نمونہ تھے........انہوں نے کئی ادارے قائم کیے جن میں فیض العلوم جمشید پور، ادارۂ شرعیہ پٹنہ، اسلامک مشنری کالج بریڈفورڈ انگلینڈ، جامعہ مدینۃ الاسلام ہالینڈ، جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء دہلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ صاحب طرز ادیب تھے۔ ان کی نگارشات دل آویز ہوتیں اور حوالوں سے مزین بھی........دل و دماغ دونوں کے لیے کشش رکھتیں ....اور ایک خاص خوبی یہ کہ دوست بھی مائل اور دشمن بھی قائل............وہ اپنے قاری کو تنہا نہ چھوڑتے........بلکہ اپنے ساتھ لے کر چلتے........پھر اپنا بنا لیتے۔ یقین نہ آئے تو ان کی مشہور زمانہ تصانیف زلزلہ، زیروزبر، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی وغیرہ دیکھ لیں۔

انہوں نے میدان صحافت میں بھی اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ جام نور، جام کوثر، رفاقت اور شان ملت نام کے رسالے اس کی روشن مثالیں ہیں۔

علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کے صاحبزادے علامہ ڈاکٹر غلام زرقانی زید مجدہ لائق تحسین ہیں کہ علامہ موصوف کے بکھرے ہوئے قلمی اثاثے کو حسن ترتیب کے ساتھ قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ میں ''شخصیات'' کی اشاعت پر انہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ مولی تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین

غوث اعظم حضرت

شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ

کبھی آنکھوں میں کبھی خانۂ دل میں رہنا
روح بن کر مری رگ رگ میں سمانا یاغوث

علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ

2

جیلان کا تاجدار

نام .... سید عبدالقادر رضی اللہ عنہ

کنیت .... ابو محمد

لقب .... محی الدین، غوث اعظم اور محبوب سبحانی

مقام ولادت .... جیلان نام کا قصبہ

تاریخ ولادت .... یکم رمضان المبارک ۴۷۰ھ ہجری

تاریخ وصال .... ۱۱ر ربیع الآخر ۵۶۱ھ ہجری

مرقد انور .... بغداد مقدس

سلسلۂ نسب ...... والد ماجد کی طرف سے سبط رسول حضرت سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ اور والدہ ماجدہ کی طرف سے سبط پیغمبر حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔

خراج عقیدت

کونین کا وہ عظیم دستگیر جس کی جلالت شان کا ڈنکا کائنات ہستی کے شش جہات میں بج رہا ہے اور جس کی خداداد شوکتوں کے پرچم پہاڑوں کی چوٹیوں پہ لہرا رہے ہیں، اس کے مدح سراؤں اور منقبت خوانوں کی ہزاروں میل لمبی صف میں کہیں بھی جگہ پا جانا زندگی کا سب سے بڑا اعزاز سمجھتا ہوں۔

نقیبوں کی آواز

سرکار غوث الوریٰ کی عظمت مقام کا کیا پوچھنا؟ کہتے ہیں کہ ابھی فرش گیتی قدموں کی ٹھوکر سے سرفراز بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان کے خورشید کمال کا سپیدۂ سحر دلوں کے آفاق پر چمک رہا تھا۔ رحمت و نور کے کتنے ہی آبشاروں نے اس بحر بیکراں سے زندگی کی خیرات مانگی اور وقت کے بڑے بڑے مسند نشینوں نے اپنے امیر کشور کی آمد کے غلغلے بلند کیے، سرکار غوث الوریٰ کی کتاب زندگی کا یہی وہ باب ہے جسے پڑھنے کے بعد اقلیم ولایت میں ان کی شہنشاہی کا یقین چمکنے لگتا ہے۔

انبیاء سابقین نے ہزاروں سال پیشتر اگر مطلع رسالت پر ایک آفتاب کے طلوع ہونے کی خبر دی تھی تو یہاں بھی مظہر اتم کی شان یوں جلوہ گر ہوئی کہ ظہور سے سینکڑوں سال قبل روئے زمین کے اولیاء کاملین نے ولایت کے آفاق پر ایک خورشید کے چمکنے کی بشارتیں دیں، ان کے مناقب و محامد کے خطبے پڑھے اور ہراول دستوں کی طرح دلوں کی سرزمین کو ایک شہنشاہ کی جلوہ گری کے لیے ہموار کیا۔

امام حسن عسکری کی بشارت

خانوادۂ اہل بیت کے چشم و چراغ حضرت امام حسن عسکری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں خاندان کا مقدس خرقہ اپنے وارث کے حوالے کیا اور ارشاد فرمایا کہ پانچویں صدی کے اخیر میں عراق کی سرزمین سے ایک عارف باللہ کا ظہور ہوگا، جس کا نام عبدالقادر اور لقب محی الدین ہوگا۔ یہ امانت بحفاظت تمام اس تک پہنچا دی جائے۔ چنانچہ وہ مقدس امانت نسل در نسل منتقل ہوتی رہی یہاں تک کہ ماہ شوال ۴۹۹ھ ہجری میں ایک امین وقت کے ذریعہ سرکار غوثیت تک پہنچ گئی۔ (مخزن القادریہ)

حضرت جنید بغدادی کی بشارت

ایک دن عالم کیف میں سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ کی زبان پر یہ کلمات جاری ہوئے "قدمه على رقبتي .... قدمه على رقبتي" (ان کا قدم میری گردن پر، ان کا قدم میری گردن پر) یہ الفاظ سن کر لوگ حیران رہ گئے۔ حالت کیف کے افاقے کے بعد دریافت کیا تو ارشاد فرمایا کہ کشف باطن کے ذریعہ مجھے معلوم ہوا کہ پانچویں صدی میں عارفوں کا تاجدار پیدا ہوگا، جو مشیت یزدانی کا اشارہ پاکر ارشاد فرمائے گا.. **قدمي هذه على رقبة كل ولي الله** (میرا یہ قدم سارے اولیاء کی گردن پر ہے) اضطراب شوق میں آج ہی اس کی جلالت شان کے آگے میری گردن خم ہوگئی اور عالم کشف میں یہ الفاظ بے ساختہ زبان پر جاری ہوگئے۔ (ترغیب الناظر)

بلخ کے شیخ اعظم کی بشارت

شیخ بلخ حضرت خلیل رحمۃ اللہ علیہ نے بشارت دی کہ پانچویں صدی کے اخیر

میں خدا کا ایک برگزیدہ بندہ ظہور فرمائے گا ...... اس کا لقب محی الدین ہوگا.....اولیاء واقطاب کی سروری کے منصب پراسے فائز کیا جائے گا.....خدا کے مقرب بندے اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فخر محسوس کریں گے ......اور حیات ظاہری کے بعد بھی اس کے تصرفات کا سلسلہ جاری رہے گا۔(بہجۃ الاسرار)

شیخ ابو بکر بطائحی کی بشارت

اپنے وقت کے عظیم بزرگ حضرت شیخ ابو بکر بطائحی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ عراق میں آٹھ اوتاد ہیں۔

۱۔حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ ۲۔حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

۳۔حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ ۴۔حضرت منصور ابن عمار رحمۃ اللہ علیہ

۵۔حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ۶۔ حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ

۷۔حضرت سہل ابن عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ ۸۔حضرت عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ

لوگوں نے حیرت سے دریافت کیا کہ حضور! یہ عبد القادر جیلانی کون بزرگ ہیں؟ ارشاد فرمایا کہ غوثیت کبری کے منصب پر فائز ہونے والے جو پانچویں صدی میں تشریف لا رہے ہیں۔عجم میں پیدا ہوں گے اور بغداد میں سکونت فرمائیں گے۔(بہجۃ الاسرار)

خواب میں رسول الثقلین کی تشریف آوری

بات اتنے ہی پہ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ واقعات کے مستند راویوں کا بیان ہے کہ جس شب میں غوث الوریٰ کے جلوۂ نور سے جیلان کا نصیبہ چمکا اور خاکدان ہستی کے چہرے پر آفتاب غوثیت کی کرن پھوٹی اسی رات کو سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں

تشریف لائے اور آپ کے والد ماجد کو یہ عظیم و جلیل بشارت مرحمت فرمائی کہ یا ابا صالح اعطاک اللہ تعالیٰ ابنا صالحا وھو ولدی ومحبوبی و محبوب اللہ تعالیٰ وسیکون لہ شان عال فی الاولیاء والاقطاب ۔ (ترغیب الناظر)

ترجمہ: اے ابو صالح تجھے اللہ تعالیٰ نے ایک فیروز مند بیٹا عطا فرمایا ہے، جو میرا معنوی فرزند ہے اور میرا اور میرے رب کا محبوب ہے۔ اولیاء و اقطاب کی صفوں میں اس کی بہت بلند و بالا شان ہو گی۔

اللہ اکبر! گہوارۂ مادر میں جس کے ستارۂ اقبال کی ارجمندی پر کونین کا فرمانروائے اعظم اپنی مہر تصدیق ثبت فرما رہا ہے، اب کس کا یارا ہے کہ عہد شباب میں اس کی عظمتِ کمال کا اندازہ لگائے۔

حرم سرائے شوق کی کہانی

حیرتوں کا خوگر بننا ہے تو ذرا وہ داستان بھی پڑھئے جو ولادت باسعادت کی تمہید ہے اور جس واقعہ سے اس حقیقت پر نہایت تیز روشنی پڑتی ہے کہ غوث الوریٰ کے ظہور کے لیے کیسے کیسے اہتمام کئے گئے اور ان کی پاک سرشت کو رحمت و نور کے کتنے آبشاروں سے گزارا گیا۔

کہتے ہیں کہ رمضان المبارک کے مہکتے ہوئے دن تھے...... چمنستان حیات میں بہاروں کا موسم تھا...... شام کا سورج ڈوب رہا تھا......... آپ کے والد ماجد حضرت ابو صالح رضی اللہ عنہ دریائے دجلہ کے کنارے تشریف فرما تھے...... اتنے میں آپ کی نظر ایک بہتے ہوئے سیب پر پڑی........ آپ نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا اور اس سے افطار فرمایا...... اس کے بعد ہی دفعۃً دل میں خیال گزرا کہ نہ جانے یہ کس کا سیب تھا...... مالک

کی اجازت کے بغیر میں نے کھالیا........قیامت کے دن اگر مجھ سے مواخذہ ہوا تو کیا جواب دوں گا۔

یہ خیال آتے ہی دل کی کائنات ہل گئی۔خوف الٰہی کے اضطراب میں اٹھے اور سیب کے مالک کا سراغ لگانے کے لیے دریا کے کنارے بہتے ہوئے دھارے کی مخالف سمت پر چل پڑے۔کافی مسافت طے کرنے کے بعد آپ کو دریا کے ساحل پر ایک عظیم الشان محل نظر آیا، جس میں سیب کا ایک بہت بڑا باغ تھا اور پھلوں سے لدی ہوئی ایک درخت کی شاخیں دریا کی سطح پر پھیلی ہوئی تھیں۔یہ دیکھ کر آپ کو یقین ہو گیا کہ اسی باغ کا سیب میں نے کھایا ہے۔

چنانچہ اب آپ نے باغ کے مالک کی تلاش شروع کی۔دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس باغ کے مالک اپنے وقت کے عظیم وجلیل بزرگ اور بے مثال ویکتا عارف حضرت سید عبداللہ صومعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

آپ شرمسار و خجل ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

"میں نے آپ کے باغ کا ایک بہتا ہوا سیب آپ کی اجازت کے بغیر کھالیا ہے۔میں اپنی فروگذاشت پر نادم ہوں۔مجھے معاف کر دیجئے تاکہ محشر میں حق العبد کے مواخذہ سے بچ جاؤں۔"

حضرت صومعی نے نظر اٹھا کر چہرے کی طرف دیکھا.....لوح جبیں پر غوث الوریٰ کا نور چمک رہا تھا.......جلوۂ حقیقت کا نقاب الٹتے ہی کونین کا درخشاں مستقبل نگاہوں کے سامنے آ گیا.....قدرے توقف کے بعد فرمایا:

"دو شرطوں پر میں تمہاری تقصیر معاف کر سکتا ہوں..........پہلی شرط تو یہ ہے کہ دس سال میرے قریب رہ کر ان مقامات سے تمہیں گذرنا ہوگا جو باطن کی تطہیر، روح کے

تزکیے اور عرفان کی منزل تک پہنچنے کے لیے ضروری ہیں...........اور دوسری شرط دس سال کی مدت تمام ہو جانے کے بعد ظاہر کروں گا۔ ''

محشر کی سرخروئی اور اخروی اعزاز کی تمنا میں حضرت صالح نے اس شرط کو بطیب خاطر منظور فرمالیا۔

اب وہ ایک رہبر کامل کے سایۂ عاطفت میں آگئے تھے۔ ذکر وفکر، ریاضت و عبادت اور یادالٰہی کی لذتوں میں دن گزارتے رہے۔ اسرار غیب کے جلووں کا قرب بڑھتا گیا اور مشاہدۂ حق کی روشنی تیز سے تیز تر ہوتی گئی یہاں تک کہ دس سال کی مدت جس دن تمام ہوئی وہ اقلیم عشق وعرفان کی مسافت طے کر چکے تھے۔

دوسرے دن حضرت صومعی نے انہیں اپنے قریب بلایا اور فرمایا:

'' اب میری دوسری شرط باقی رہ گئی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ اسے ظاہر کردوں۔ میری ایک ناکتخدا لڑکی ہے، جس میں پانچ عیب ہیں۔ پہلا عیب یہ ہے کہ وہ گونگی ہے۔ دوسرا عیب یہ ہے کہ وہ بہری ہے۔ تیسرا عیب یہ ہے کہ وہ اندھی ہے۔ چوتھا عیب یہ ہے کہ وہ لنگڑی ہے۔ پانچواں عیب یہ ہے کہ وہ لولی ہے۔ تم اسے اپنے حبالۂ عقد میں قبول کرلو۔ ''

حضرت ابوصالح نے اسی جذبے میں اس شرط کو بھی منظور فرمالیا۔ عقدِ نکاح کے بعد جب شب زفاف آئی اور حضرت ابوصالح حجلۂ عروسی میں داخل ہوئے۔ ایک لالۂ رخ، زہرہ جمال اور جسم و اعضاء کی صحیح وسالم دوشیزہ کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور فوراً الٹے پاؤں واپس چلے آئے۔

حضرت صومعی کو خبر ہوئی تو انہوں نے وجہ دریافت کی۔ نگاہیں نیچی کیے عرض کیا:

'' جن پانچ عیبوں کی نشاندہی آپ نے فرمائی تھی وہاں تو ایک عیب بھی نہیں ہے۔ اس لیے اجنبی عورت سمجھ کر میں واپس چلا آیا۔ ''

یہ شانِ تقویٰ دیکھ کر حضرت صومعی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو اُمڈ آئے۔ عالم کیف میں فرمایا:

" یقین کر و وہی تمہاری رفیقۂ حیات ہے۔ جن پانچ عیبوں کی میں نے نشاندہی کی ہے، وہ طہارت وعفت کے حقائق کی تعبیرات ہیں۔

وہ اندھی ہے...... یعنی آج تک کسی نامحرم کے چہرے پر اس کی نظر نہیں پڑی ہے۔ وہ گونگی ہے...... یعنی آج تک اس نے کوئی ناشائستہ بات اپنے منہ سے نہیں نکالے۔ وہ بہری ہے...... یعنی آج تک کسی اجنبی کی آواز کو اس نے اپنے پردۂ سماعت تک نہیں پہنچنے دیا ہے۔ وہ لنگڑی ہے...... یعنی آج تک معصیت کی طرف اس کے قدم نہیں اٹھے ہیں۔ وہ لولی ہے یعنی آج تک اپنے ہاتھوں سے اس نے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔ "

یہ حیرت انگیز خبر سن کر حضرت ابوصالح خوشی سے جھوم اٹھے اور ایک تقدس پیکر، وفا سرشت اور پاک طینت شہزادی کو اپنے حریم زندگی میں پا کر جذبۂ شکر سے معمور ہو گئے۔

غوثیت کبری کے نقوش

صحن ہستی میں قدم رکھتے ہی سرکار غوثیت کے محامد وتجلیات کی دھوم مچ گئی۔ گہوارۂ مادر سے لے کر مکتب ومسجد کے صحن تک ہر طرف ایک بالاتر ہستی کے آثار جگمگانے لگے۔ جدھر سے گذر جاتے رجال الغیب کے دستے پرے جمائے کھڑے رہتے۔

علوم ظاہری کی تکمیل کے لیے بغداد کے سفر میں جو خوارق عادات اور عجائب وغرائب ظہور میں آئے، انہوں نے سارے زمانے کو چونکا دیا۔ عہد طالب علمی میں آزمائشوں کا وہ دور بھی گذرا جب کہ مسلسل فاقوں سے جگر کا خون سوکھنے لگا اور ضعف ونقاہت حد سے بڑھ گئی۔ یہی وہ دور تھا جب کہ مذہب عشق کے فرائض کی تکمیل ہوئی۔ اور

آپ مسلسل چالیس سال تک عشاء کے وضو سے نماز صبح ادا کی گئی۔

معبود کے آستانے پر بندگی کا سر نیاز اس طرح خم ہوا کہ رحمت یزدانی اپنے بندۂ مقرب کی ناز بردار بن گئی......اب رحمتیں آ کے مناتی ہیں تو کھاتے ہیں....سلاتی ہیں تو سوتے ہیں.......پہناتی ہیں تو پہنتے ہیں........ایک روٹھے ہوئے محبوب کی طرح بات بات پر منایا جارہا ہے۔

عرش کی قندیل لے کے دونوں جہاں کی وسعتوں میں گھوم جاؤ صفِ اولیاء میں اس شان کا کوئی اور نہیں پاؤ گے۔

بالآخر وہ سحر بھی طلوع ہوئی جب کہ بغداد کی سرزمین پر جلالتِ شاہانہ کا تخت بچھا..........اور فرق اقدس پر غوثیت کبریٰ کا تاج پہن کر جب سریر آرا ہوئے تو عظمت خداداد کی ہیبت سے پہاڑوں، صحراؤں اور سمندروں کے دل کانپ گئے....... پائیگاہ سلطانی میں کشور ولایت کے سارے عمائدین کی گردنیں جھک گئیں۔

اس وقت سے لے کر آج تک بغداد کا دیار قدس غوث الوریٰ کی راجدھانی کی حیثیت سے سارے صحت مند دلوں کا مرکز عقیدت ہے۔

گو وہ آج نظر کے سامنے نہیں ہیں، لیکن عشق وایمان کی ہر انجمن میں ان کے جلوؤں کی سحر کا اجالا پھیلا ہوا ہے۔ان کی نادیدہ چارہ گری، ان کی روحانی دستگیری اور ان کے غیبی تصرفات کے عقیدے پر مشاہدات وتجربات کی اتنی تیز دھوپ پڑ رہی ہے کہ عقل وہوش کی سلامتی کے ساتھ انکار ممکن نہیں ہے۔

گیارہویں شریف کا یہ موسم بہار اس یقین کا زندۂ جاوید ثبوت ہے کہ خدا جب کسی بندے کو مسند تقرب پر فائز کرتا ہے تو اس کی محبت وشیفتگی کے لیے قلوب کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔

اس لیے کہنے دیا جائے کہ جیلانی تاجدار کی محفلوں کے یہ چراغ خود نہیں جلے ہیں جلائے گئے ہیں۔ پھر مشیت ایزدی جب چراغوں کی نگرانی کر رہی ہے، انہیں کون بجھا سکتا ہے۔ وہ طوفان کی گود اور آندھیوں کی زد پر بھی جلتے رہیں گے۔

خدا ہمارے دلوں کے گنجہائے گرانمایہ کی حفاظت فرمائے۔

☆☆☆

سلطان الهند خواجه

معین الدین چشتی رضی الله عنه

درِ اقدس کا ہر ذرہ غبار طور سینا ہے
دلِ روشن گزر گاہِ حرم ہے میرے خواجہ کا
کہاں سے آ رہی ہے حشر میں آواز ارشدؔ کی
گنہگارو چلو باغِ ارم ہے میرے خواجہ کا

خواجۂ خواجگان

تاریخ ولادت: .... ۵۳۰ھ ہجری

بمقام: ....سنجر علاقہ سیستان

تاریخ وصال: ....۶؍رجب المرجب ۶۲۷ھ ہجری

بمقام: ....اجمیر مقدس

نام نامی اسم گرامی: ....معین الدین حسن

القاب: ....ہند الولی، عطائے رسول، غریب نواز، خواجۂ بزرگ، آفتاب چشتیاں، سلطان الہند، نائب رسول اللہ، وارث الانبیاء

چشتی کہلانے کی وجہ

بیان کرتے ہیں کہ آپ کے سلسلہ طریقت کے مورث اعلیٰ حضرت خواجہ ابو اسحاق شامی رضی اللہ عنہ جب حصول بیعت کی غرض سے حضرت خواجہ ممشاد علی دینوری

رضی اللہ عنہ کی سرکار میں حاضر ہوئے تو انہوں نے سب سے پہلے نام دریافت کیا۔

عرض کیا: "عاجز کو ابو اسحاق شامی کہتے ہیں۔"

فرمایا: "آج سے ہم تجھے ابو اسحاق چشتی کہیں گے اور قیامت تک جو تیرے سلسلے میں داخل ہوگا وہ بھی چشتی کہلائے گا۔"

اسی نسبت سے خواجۂ بزرگ بھی "چشتی" کہلاتے ہیں۔

نسب نامہ

باپ کی طرف سے آپ کا سلسلۂ نسب گلگوں قبا شہیدِ کربلا سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ اور ماں کی طرف سے امام الہدیٰ سیدنا حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ سرکار غریب نواز کی والدۂ ماجدہ حضور غوث پاک رضی اللہ عنہ کی چچازاد بہن ہیں۔ اس رشتے سے حضور غوث پاک رضی اللہ عنہ خواجہ غریب نواز کے ماموں ہوتے ہیں۔

عہد طفلی کا ایک رقت انگیز واقعہ

عید کا دن تھا۔ ہر طرف مسرتوں کی چہل پہل تھی، ساری فضا رنگا رنگ پھولوں کی خوشبو سے مہک اٹھی تھی۔ آبادی کے ہر گوشے سے فرزندانِ اسلام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر عید گاہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بیش قیمت پیراہن میں ملبوس حضرت خواجہ بھی اپنے گھر والوں کے ہمراہ عید گاہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اثناء راہ ان کی نظر ایک نابینا لڑکے پر پڑی جو رہگذر کے قریب اداس غمگین کھڑا تھا۔ اس کا اترا ہوا چہرہ، شکستہ پیراہن، غربت زدہ حال اور بے چارگی دیکھ کر حضرت خواجہ کا دل بھر آیا۔ اسی وقت اپنے کپڑے اتار کر اس غریب و نابینا بچے کو پہنا دیا اور اسے اپنے ہمراہ عید گاہ لے گئے۔ اس واقعہ کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا

54943

کہ بچپن ہی سے حضرت ''غریب نواز'' تھے۔

تعلیم وتربیت

سات سال کی عمر شریف تک آپ کی پرورش خراسان میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کا زمانہ والد بزرگوار کے زیر عاطفت گزرا۔ اس کے بعد سنجر کی مشہور درسگاہ میں داخل ہوئے اور وہیں سے تفسیر وحدیث اور فقہ کی تعلیم مکمل ہوئی۔ چودہ سال کی عمر شریف میں والد بزرگوار کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کے والد ماجد کا مزار مبارک بغداد مقدس میں ہے۔

ایک مجذوب سے ملاقات

کہتے ہیں کہ ایک دن آپ اپنے باغ کو سیراب کر رہے تھے کہ اپنے وقت کے ایک مشہور مجذوب حضرت ابراہیم قندوری باغ میں تشریف لائے۔ حضرت خواجہ نے نہایت عزت واحترام سے انہیں بٹھایا اور خوشۂ انگور سے ان کی تواضع فرمائی۔ خواجہ کے حسن سلوک سے مجذوب کا دل خوش ہوگیا۔ انہوں نے اپنی تھیلی سے سوکھی ہوئی روٹی کا ایک ٹکڑا نکالا اور دانت سے چبا کر حضرت خواجہ کو پیش کیا۔ اسے کھاتے ہی دل کی حالت بدل گئی۔ سرمستی عشق کی ایک ہی جنبش میں علائق کی زنجیر ٹوٹ گئی۔ اسی عالم میں حضرت خواجہ نے باغ اور پن چکی فروخت کر کے ساری قیمت فقراء ومساکین پر لٹادی اور حالت بیخودی میں خراسان کی طرف نکل گئے۔

خراسان سے ہندوستان تک کا طویل سفر نامہ:

۵۴۵ھ ہجری سے ۶۲۲ھ ہجری تک ستہتر سال کا اکثر حصہ آپ نے سفر میں گزارا۔ اس درمیان میں کہیں ہفتوں، کہیں مہینوں اور کہیں سالوں تک قیام بھی ثابت

ہے۔سفر کی پوری تاریخ چونکہ مرتب حالت میں نہیں ہے، اس لیے اجمالی طور پر صرف ان مقامات کی فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے جو دوران سفر میں سرکار کے قدموں کے نیچے سے گذر گئے ہیں:

۱۔خراسان ۲۔سمرقند ۳۔بخارا ۴۔عراق ۵۔ہارون ۶۔عرب
۷۔بغداد ۸۔کرمان ۹۔ہمدان ۱۰۔تبریز ۱۱۔استرآباد ۱۲۔خرقان
۱۳۔میمنہ ۱۴۔ہرات ۱۵۔افغانستان ۱۶۔غزنی ۱۷۔رے ۱۸۔فالوجہ
۱۹۔مکہ معظّمہ ۲۰۔مدینہ طیبہ ۲۱۔بدخشاں ۲۲۔دمشق ۲۳۔جیلان
۲۴۔چشت ۲۵۔اصفہان ۲۶۔ہندوستان براہ ملتان، لاہور، دہلی، اجمیر مقدس۔

اس سفرنامے میں بیس سال کی وہ مدت بھی شامل ہے جو حضرت خواجہ نے اپنے پیرو مرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونی رضی اللہ عنہ کی ہمرکابی میں گذاری ہے۔اس سفر میں سرکار بغداد حضرت غوث پاک رضی اللہ عنہ سے بھی حضرت خواجہ کی کئی بار ملاقات ہوئی ہے۔ایک ملاقات میں سرکار خواجہ کے متعلق حضور غوث اعظم رضی اللہ عنہ کی یہ بشارت بھی منقول ہے کہ یہ مرد مقتدائے عالمین سے ہوگا اور اس کے ذریعہ بیشمار طالبان حق منزل مقصود کی پہنچیں گے۔

مرشد سے ملاقات

''انیس الارواح'' نامی کتاب میں خود حضرت خواجہ نے اپنے قلم سے اپنے مرشد کی ملاقات اور بیعت کا واقعہ یوں تحریر فرمایا ہے:

[[**مسلمانوں کا یہ دعا گو معین الدین سنجری بمقام بغداد شریف خواجہ جنید کی مسجد میں اپنے مرشد پاک حضرت خواجہ عثمان ہارونی قدس سرہ کی دولت پابوسی سے مشرف ہوا۔**

اس وقت روئے زمین کے مشائخ کبار حاضر خدمت اقدس تھے۔ جب اس درویش نے سر نیاز زمین پر رکھا تو پیرومرشد نے ارشاد فرمایا: ''دو رکعت نماز ادا کر'' میں نے ادا کی۔ پھر فرمایا: '' قبلہ رو بیٹھ '' میں بیٹھ گیا۔ حکم دیا: '' سورہ بقرہ پڑھ '' میں نے پڑھی۔ فرمان ہوا: '' اکیس بار درود شریف پڑھ '' میں نے پڑھا۔ پھر آپ کھڑے ہو گئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر آسمان کی طرف منہ کیا اور فرمایا: '' آ تجھے خدا تک پہنچا دوں '' بعد ازاں مقراض (قینچی) لے کر دعا گو کے سر پر چلائی اور کلاہ چہارتر کی اس درویش کے سر پر رکھی اور گلیم خاص عطا فرمائی۔ پھر ارشاد فرمایا: ''بیٹھ جا'' میں بیٹھ گیا۔ فرمایا: '' ہمارے خانوادہ میں ایک شبانہ روز کے مجاہدہ کا معمول ہے تو آج رات اور دن مشغول رہ '' یہ درویش بموجب فرمان عالی مشغول رہا۔ دوسرے دن جب حاضر خدمت ہوا تو ارشاد فرمایا: '' آسمان کی طرف دیکھ'' میں نے دیکھا۔ دریافت فرمایا: ''کہاں تک دیکھتا ہے؟'' عرض کیا کہ عرش اعظم تک ۔ پھر فرمایا: '' زمین کی طرف دیکھ'' میں نے دیکھا۔ استفسار فرمایا: '' کہاں تک دیکھتا ہے؟'' عرض کیا کہ تحت الثریٰ تک ۔ فرمایا: '' پھر ہزار بار سورۂ اخلاص پڑھ'' میں نے پڑھی۔ فرمایا: '' پھر آسمان کی طرف دیکھ'' میں نے دیکھا۔ پوچھا: '' اب کہاں تک دیکھتا ہے؟'' عرض کیا کہ حجاب عظمت تک ۔ فرمایا: '' آنکھیں بند کر'' میں نے بند کر لیں۔ فرمایا: '' کھول دے'' میں نے کھول دیں۔ پھر مجھے اپنی انگلیاں دکھا کر سوال کیا: '' کیا دیکھتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اٹھارہ ہزار عالم ۔ بعد ازاں سامنے پڑی ہوئی ایک اینٹ کے اٹھانے کا حکم دیا۔ میں نے اٹھایا تو اس کے نیچے اشرفیوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ فرمایا: '' اسے لے جا کر فقراء میں تقسیم کر دے'' میں نے حکم کی تعمیل کی ۔ واپس لوٹ کر آیا تو ارشاد ہوا: '' چند روز ہماری صحبت میں گذار'' عرض کیا فرمان عالی سر اور آنکھوں پر۔

(انیس الارواح) [[

حضرت خواجہ کے قلم سے واقعہ بیعت کی یہ ایمان افروز سرگذشت غور سے

پڑھیے۔ نقطۂ آغاز پر جب عالم غیب کے انکشافات کا یہ حال ہے کہ تحت الثریٰ سے حجاب عظمت تک ساری کائنات نظر کے سامنے ہے تو اس کے بعد کے مقام کشف وعرفان کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟

حرمین طیبین کی حاضری

اپنی اسی کتاب ''انیس الارواح'' میں ایک مقام پر حضرت خواجہ تحریر فرماتے ہیں کہ حرم کعبہ کی پاک سرزمین پر ایک دن پیرومرشد نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے حق تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد میزاب رحمت کے نیچے کھڑے ہو کر دعا گو کے حق میں نہایت درد انگیز مناجات کی۔ پردۂ غیب سے آواز آئی: '' ہم نے معین الدین کو قبول کر لیا ''

فرماتے ہیں کہ حرم مکہ کی معنوی برکتوں اور سرمدی نعمتوں سے جب ہم بہرہ یاب ہو چکے تو پیرومرشد نے اس شہر محترم کا رخ کیا جو کائنات گیتی کا مرکز عشق ہے۔ طیبہ کی پرنور وشاداب آبادی پر جیسے ہی نظر پڑی جذبۂ شوق کا عالم زیروزبر ہو گیا۔ اس محبوب سرزمین کی خاک کو آنکھوں سے لگایا، بوسہ لیا اور روحانی نشاط سے شادکام ہوئے۔

سلطان کونین کے دربار میں حاضری کا سماں احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ جب مواجہ اقدس میں پہنچے تو پیرومرشد نے فرمایا: '' دو جہاں کے مالک کو سلام کر ''

میں نے انتہائی ادب واحترام کے ساتھ سلام عرض کیا۔ روضۂ پاک سے آواز آئی:

'' وعلیکم السلام یا قطب مشائخ بر و بحر ''

یہ جواب سن کر پیرومرشد نے سجدۂ شکر ادا کیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''اب تو درجۂ کمال کو پہنچ گیا ''

خرقۂ خلافت

دوران سفر میں بیس سال تک اپنے پیرومرشد کی خدمت کرنے کے بعد حضرت خواجہ ۵۲ سال کی عمر میں اپنے پیرومرشد سے رخصت ہوئے۔ دم رخصت پیرومرشد نے آپ کو خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا اور تبرکات محمدی جو حضرات خواجگان چشت میں سلسلہ بسلسلہ چلے آرہے تھے، آپ کو عطا فرما کر اپنا جانشیں اور صاحب سجادہ بنادیا۔ خود حضرت خواجہ نے ان واقعات کی تفصیل اپنے قلم سے یوں بیان فرمائی ہے۔

" آقائے نعمت حضرت پیرومرشد نے ارشاد فرمایا: اے معین الدین میں نے یہ سب کام تیری تکمیل کے لیے کیا ہے۔ تجھ کو اس پر عمل کرنا لازم ہے۔ فرزند خلف وہی ہے جو اپنے ہوش وگوش میں اپنے پیر کے ارشادات کو جگہ دے۔ "

اس ارشاد کے بعد وہ عصائے مبارک جو مرشد کے سامنے رکھا تھا، دعا گو کو عطا فرمایا۔ بعدازاں خرقہ شریف، نعلین، چوبیں اور مصلی بھی عنایت فرمایا، پھر ارشاد فرمایا:

" یہ تبرکات ہمارے پیران طریقت قدس اللہ اسرارہم کی یادگار ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک پہنچے ہیں اور ہم نے تجھے دیے ہیں۔ ان کو اسی طرح اپنے پاس رکھنا جس طرح ہم نے رکھا۔ جس کو مرد پانا اس کو ہماری یہ یادگار دینا۔ "

یہ ارشاد فرما کر مجھے اپنی آغوش مبارک میں لے لیا۔ سر وچشم کو بوسہ دیا اور فرمایا تجھ کو خدا کے سپرد کیا۔ پھر عالم تحیر میں مشغول ہوگئے۔ دعا گو رخصت ہوا۔

ایام سفر کے عجائب وغرائب

۷۷ سال کی طویل مدت سفر میں علم وارشاد کے بڑے بڑے مشاہیر اور نادرۂ روزگار اصحاب کمال سے آپ کی ملاقاتیں ہوئیں۔ دلوں کی تسخیر، روحوں کا تزکیہ اور جہان

آب وگل میں تصرفات کے ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات آپ سے ظہور میں آئے جن پر آج تک عقل ودانش کو سکتہ ہے۔

عظمت خداداد کی ایک باوثوق شہادت کے طور پر چند واقعات ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

پہلا واقعہ : فوائد السالکین میں حضرت قطب الاقطاب خواجہ بختیار کاکی رضی اللہ عنہ تحریر فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے پیر ومرشد حضرت خواجہ کے ساتھ سفر حج میں تھا تو ایک دن صبح کی نماز کے بعد روانہ ہو کر ہم لوگ ایک شہر میں پہنچے۔ یہاں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی جو ایک غار میں مثل سوکھی لکڑی کے اپنی آنکھیں وا کیے ہوئے عالم حیرت میں کھڑے تھے۔ ایک ماہ تک ہم ان کے پاس رہے۔ اس عرصے میں وہ صرف ایک بار عالم ہوش کی طرف واپس لوٹے۔ ہم نے اٹھ کر انہیں سلام کیا۔

انہوں نے جواب مرحمت فرمایا اور بتایا کہ میں شیخ محمد اسلم طوسی کا فرزند ہوں۔ تیس سال سے عالم تحیر میں غرق ہوں۔ نہ مجھے دن کی خبر ہے نہ رات کی۔ خدائے تعالیٰ صرف تمہاری وجہ سے آج مجھے عالم ہوش میں لایا ہے۔

اتنا کہہ کر وہ پھر عالم تحیر میں مشغول ہو گئے۔

دوسرا واقعہ : حضرت خواجہ ۵۸۳ ہجری میں مکہ معظمہ پہنچے۔ ایک دن حرم شریف میں آپ مشغول عبادت تھے کہ پردۂ غیب سے آواز آئی:

" اے معین الدین! ہم تجھ سے خوشنود ہوئے اور تجھے بخشدیا۔ اپنے تقرب کی بساط پر میں نے تجھے نہایت اعزاز کی جگہ مرحمت فرمائی۔ جو بھی تیری آرزو ہو سوال کرتا کہ میں عطاؤں سے سرفراز کردوں۔ "

آپ نے عرض کیا: خداوندا! ایک بندۂ حقیر کے لیے اس سے بڑی اور کیا مسرت ہو سکتی ہے کہ تو نے مجھے اپنے حضور میں قبول فرمالیا۔ اس کے بعد اگر کوئی آرزو ہے تو صرف یہ کہ تو اپنے فضل سے میرے سلسلے کے مریدین کو بخشدے۔

" ارشاد ہوا: معین الدین! تو میرا بندۂ خاص ہے۔ تیری آرزو مبارک ہو کہ قیامت تک جو بھی تیرے سلسلے میں منسلک ہوں گے میں انہیں بخش دوں گا۔ "

تیسرا واقعہ: فوائد السالکین میں حضرت خواجہ قطب الاقطاب تحریر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ شیخ اوحدالدین، شیخ شہاب الدین سہروردی اور میرے پیر و مرشد خراسان کے ایک شہر میں بیٹھے تھے کہ ناگہاں سطان شمس الدین التمش سامنے سے گزرا۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک پیالہ لیے ہوئے تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب اس کی عمر بارہ سال کی تھی۔

جیسے ہی حضرت خواجہ کی نظر اس پر پڑی بے ساختہ ارشاد فرمایا:

" جب تک یہ لڑکا دہلی کا بادشاہ نہ ہولے گا خدا اسے دنیا سے نہ اٹھائے گا۔ "

حضرت خواجہ کی زبان غیب ترجمان سے نکلا ہوا یہ جملہ تیر قضا کی طرح نشانے پر بیٹھا۔ تاریخ ہند شاہد ہے کہ سرکار خواجہ کے ارشاد کے مطابق ۶۰۷ھ ہجری میں شمس الدین التمش نام کا ایک گمنام شخص طوفان کی طرح اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے ہندوستان پر چھا گیا اور حضرت خواجہ کی ایک کھلی ہوئی کرامت بن کر بالآخر ایک دن دہلی کے تخت پر اس نے قبضہ کرلیا۔

چوتھا واقعہ: کہتے ہیں کہ سبزہ زار (افغانستان) کا حاکم یادگار محمد ایک بڑا ظالم اور بدمزاج شخص تھا۔ حوالی شہر میں اس کا ایک نہایت خوبصورت باغ تھا۔ اس باغ میں ایک صاف وشفاف حوض تھا۔ دوران سفر میں ایک دن حضرت خواجہ اس باغ میں تشریف لے گئے۔ حوض میں غسل کر کے نماز ادا کی اور اس کے کنارے بیٹھ کر تلاوت قرآن میں مشغول ہو گئے۔ اسی اثنا میں یادگار محمد کے آنے کی خبر ملی۔ تھوڑی دیر کے بعد شاہانہ کر و فر کے ساتھ اس کی سواری باغ میں داخل ہوئی۔ حوض کے قریب ایک فقیر کو دیکھ کر وہ آگ بگولا ہو گیا۔ غصہ سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ باغ کے پاسبانوں سے ترش رو ہو کر دریافت کیا۔ اس فقیر بے مایہ کو شاہی باغ میں بیٹھنے کی اجازت کس نے دی؟ حاکم وقت کا قہر وجلال دیکھ کر

ملازمین شاہی کانپ اٹھے۔ قبل اس کے کہ عذر خواہی کے لیے وہ اپنی زبان کھولتے، ہیبت و دہشت کے اس سناٹے میں اچانک حضرت خواجہ کی نگاہ اٹھی۔ نظر کا چار ہونا تھا کہ ہیبت وجلال سے یادگار محمد کانپنے لگا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ آپ نے پانی منگوا کر اس کے منہ پر چھینٹے دیے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوش میں آ گیا اور نہایت عاجزی کے ساتھ اپنی تقصیر کی معافی چاہی اور اپنے تمام خدم وحشم کے ساتھ وہ حضرت خواجہ کے حلقۂ غلامی میں داخل ہو گیا۔

پانچواں واقعہ: بیان کرتے ہیں کہ ایک سفر میں حضرت خواجہ مناسک حج ادا کرنے کے بعد مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور عرصہ تک مسجد قبا میں مشغول عبادت رہے۔ ان ایام میں ایک دن آپ کو دربار رسالت سے بشارت ہوئی:

"اے معین الدین! تو میرے دین کا معین ہے۔ میں نے تجھے ہندوستان کی ولایت عطا کی۔ وہاں کفر کی ظلمت پھیلی ہوئی ہے۔ تو اجمیر جا۔ تیرے وجود کی برکت سے باطل کا اندھیرا چھٹ جائے گا اور چہار دانگ عالم میں اسلام کی رونق پھیل جائے گی۔"

آپ اس بشارت سے بہت مسرور ہوئے۔ مگر حیران تھے کہ اجمیر کہاں واقع ہے؟ اسی فکر میں تھے کہ آنکھ لگ گئی اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو خواب میں اپنی زیارت سے مشرف فرما کر ایک پلک جھپکتے اجمیر کا تمام شہر اور قلعہ و کوہستان آپ کو دکھلا دیا۔ آخر میں ایک بہشتی انار دے کر آپ کو رخصت فرمایا۔

چھٹا واقعہ: ۵۵۷ھ ہجری میں حضرت خواجہ پہلی بار بغداد مقدس سے ہندوستان کے سفر پر روانہ ہوئے۔ دوران سفر کے حالات بیان کرتے ہوئے حضرت خواجہ ارشاد فرماتے کہ بخارا میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ یہ از حد مشغول تھا لیکن نابینا تھا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے اس سے دریافت کیا کہ تم کب سے نابینا ہوئے۔

جواب دیا کہ منزل سلوک کی راہ طے کر رہا تھا کہ میری نگاہ ایک غیر محرم پر پڑ گئی۔

" آواز آئی کہ دعویٰ میری محبت کا کرتا ہے اور نگاہ غیر سے لڑاتا ہے۔ "

یہ آواز سن کر غیرت حیا سے میں پانی پانی ہو گیا۔ دعا کی کہ الٰہی وہ آنکھ اندھی ہو جائے جو دوست کے سوا غیر کو دیکھے۔

ابھی دعا کے یہ الفاظ پورے بھی نہ ہو پائے تھے کہ میری آنکھوں کی بصارت زائل ہو گئی۔

حضرت خواجہ بزرگ فرماتے ہیں کہ جب وہ سمرقند پہنچے تو وہاں ابو اللیث سمرقندی کے مکان کے قریب ایک مسجد تھی۔ اس کے محراب کے قبلہ رخ ہونے کے متعلق کچھ لوگوں کو شبہ تھا۔ حضرت خواجہ نے توجہ ڈالی تو نگاہوں کے سارے حجابات اٹھ گئے اور سامنے خانۂ کعبہ نظر آنے لگا۔

براہ افغانستان ملتان ہوتے ہوئے جب حضرت خواجہ غرب نواز لاہور پہنچے تو کئی مہینے تک حضرت سیدنا شیخ علی ہجویری داتا گنج بخش رضی اللہ عنہ کے مزار پرانوار پر معتکف رہے۔

آپ کا حجرۂ اعتکاف اب تک اندرون احاطۂ مزار موجود ہے۔ رخصت ہوتے وقت زبان سے یہ شعر ادا فرمایا جو عالم گیر شہرت کا حامل ہے اور آج تک درگاہ شریف کی لوح پیشانی پر کندہ ہے۔

مشہور زمانہ شعر یہ ہے۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل، کاملاں را رہنما

حضرت خواجہ کا مسلک

آج مزارات اولیاء سے روحانی استفادہ کے متعلق جو لوگ زبان طعن دراز کرتے ہیں وہ ذرا ہوش کے ناخن لیں۔ حضرت خواجہ کے اس عمل سے یہ بات اچھی طرح

صاف ہوجاتی ہے کہ مزارات اولیاء سے روحانی استفادہ اور ان کی حیات معنوی اور تصرفات روحانی کا اعتقاد جملہ اہل حق اور تمام خاصان خدا کا مسلک ومشرب اور ان کا مذہبی شعار رہا ہے۔ جو لوگ ان امور کا انکار کرتے ہیں وہ گروہ اصفیاء اور مشاہیر امت کی عام رہگذر کے خلاف ایک نئی اور باطل راہ کھولتے ہیں۔

اجمیر میں ورود مسعود

روایت کرتے ہیں کہ سرور کائنات کے فرمان عالی کے بموجب حضرت خواجہ لاہور سے براہ دہلی اجمیر پہنچے۔ آپ کے ہمراہ چالیس درویشوں کی جماعت تھی، جن کی ضرب الا اللہ سے پہاڑوں کے کلیجے دہل جاتے تھے۔ اجمیر پہنچ کر جب آپ نے شہر سے باہر ایک مقام پر سایہ دار درختوں کے نیچے قیام کرنا چاہا تو راجہ پرتھوی راج کے ساربانوں نے آکر منع کیا اور کہا کہ یہاں راجہ کے اونٹ بیٹھتے ہیں۔ آپ وہاں سے یہ فرماتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ اچھا راجہ کے اونٹ بیٹھتے ہیں تو وہی بیٹھیں۔ اور آناساگر کے قریب جا کر قیام فرمایا۔ کہتے ہیں کہ شام کے وقت جب اونٹ اپنی چراگاہوں سے واپس آئے اور اپنی جگہ پر آکر بیٹھے تو ایسے بیٹھ گئے کہ اٹھانے سے بھی نہ اٹھ سکے۔ یہ دیکھ کر ساربانوں کے افسر نے راجہ کو سارے واقعہ کی اطلاع دی۔ راجہ نے کہا کہ سوا اس کے اب کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ تم لوگ جا کر اس درویش سے معافی مانگو۔

چنانچہ ساربانوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر معذرت کی۔ آپ نے فرمایا: اچھا جاؤ، اونٹ کھڑے ہوگئے۔ آکر دیکھا تو واقعی اونٹ کھڑے ہوگئے۔

واقعات کے روای بیان کرتے ہیں کہ آناساگر کے کنارے بہت سے بت خانے تھے۔ جہاں صبح وشام پجاریوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ انہی میں ایک بڑا بت کدہ راجہ کا بھی تھا۔ اس میں پرتھوی راج اور اس کی سلطنت کے عمائدین پوجا کے لیے آیا کرتے تھے۔ اس

شاہی بت خانہ کا انتظام واہتمام سادھورام (شادی دیو) کے سپرد تھا۔ یہ اپنے دھرم کی شاستروں کا بہت بڑا فاضل اور تمام پجاریوں کا سردار تھا۔ یہاں آپ کا قیام اہل ہنود پر بہت شاق گذرا۔ انہوں نے ہر چند کوشش کی کہ آپ چلے جائیں، مگر عظمت خداداد کے آگے کسی کی نہ چلی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ روحانی مقابلے کے لیے سلطنت کے بڑے بڑے جادوگر اور جوگی بلا لیے گئے۔ لیکن حضرت خواجہ کی ایک تیغ ابرو کی جنبش سے سب تڑپ تڑپ کر گھائل ہو گئے۔

شادی دیو اور اجے پال جوگی جیسے سرغنہ کفر کا قبول اسلام حضرت خواجہ کی قاہرانہ قوت اور روحانی سطوت کی ایک عظیم الشان فتح تھی، جس نے ہندوستان کی زمین ہلا دی۔

حضرت خواجہ کے تصرفات کی دوسری زندہ کرامت یہ ہے کہ سعدی اور عبداللہ بیابانی کے نام سے خواجہ کے یہ دونوں حلقۂ بگوش آج تک نواح اجمیر میں عام نگاہوں سے اوجھل ہو کر زندہ و پائندہ ہیں۔ مشہور ہے کہ ہر شب جمعہ روضۂ خواجہ پر حاضری دیتے ہیں۔

فتح اجمیر

جب شادی دیو اور اجے پال جوگی مسلمان ہو چکے تو انہوں نے خواجہ کے حضور میں یہ التجا پیش کی کہ اب حضور چل کر وسط شہر میں قیام فرمائیں تاکہ مخلوق آپ کے قدموں کی برکت سے فیضیاب ہو سکے۔ آپ نے ان کا معروضۂ شوق قبول فرما لیا اور اپنے خادم خاص محمد یادگار کو جگہ کے انتخاب کے لیے شہر بھیجا۔ انہوں نے بہ تعمیل ارشاد وہ مقام پسند کیا جہاں اس وقت آپ کا روضۂ پاک ہے۔ شادی دیو کی یہ ایک افتادہ زمین تھی۔ اس قطعہ زمین پر جماعت خانہ، مسجد اور مطبخ کی تعمیر ہوئی۔ کہتے ہیں کہ جس جگہ آج مزار ہے وہیں مطبخ تھا۔

یہاں قیام فرمانے کے بعد آپ نے چند اشخاص کے ذریعہ پرتھوی راج کو

دعوت اسلام دی اور فرمایا کہ اگر یہ ایمان نہ لایا تو میں لشکر اسلام کے ہاتھوں اسے زندہ گرفتار کرادوں گا۔ پرتھوی راج نے اسلام قبول کرنے سے نہ صرف انکار کردیا بلکہ حضرت خواجہ کے خلاف اس کی دشمنی کی آگ اور بھڑک اٹھی۔

چنانچہ ایک دن اس نے آپ کو کہلا بھیجا کہ آپ ہماری سرحد سے باہر نکل جائیں۔ آپ نے جواب میں یہ اطلاع بھجوائی کہ مت گھبراؤ! چند دنوں میں شہاب الدین غوری آرہا ہے۔اس وقت تقدیر فیصلہ کردے گی کہ اجمیر کی سرحد سے کون نکلتا ہے؟

شہاب الدین غوری ہند کی طرف

اس واقعہ کے چند ہی دنوں کے بعد سلطان شہاب الدین غوری نے خراسان میں ایک خواب دیکھا کہ وہ حضرت خواجہ کی خدمت میں کھڑا ہے اور آپ اسے فرماتے ہیں کہ خدائے قدیر کی طرف سے ہندوستان کی بادشاہت کا سہرا میرے سر کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ کارکنان قضاوقدر فتح ونصرت کی خلعت آسمانی لیے ہوئے تیرے گھوڑوں کی ٹاپ کا انتظار کررہے ہیں۔ بغیر کسی مہلت انتظار کے اٹھ کھڑا ہو اور ہندوستان کی طرف روانہ ہوجا اور پرتھوی راج کو زندہ گرفتار کرکے اسے کیفر کردار تک پہنچا۔

خواب سے بیدار ہوا تو شہاب الدین کے سینے میں فاتحانہ عزم ویقین کا ایک تلاطم برپا تھا۔ چند ہی دنوں میں ایک لشکر جرار لے کر وہ اسلام کا پرچم لہراتا ہوا ہندوستان کی طرف چل پڑا۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ تھانیسر کے قریب تراوڑی کے میدان میں پرتھوی راج کے ساتھ اس کا ایک نہایت خونریز اور فیصلہ کن معرکہ ہوا۔

کہتے ہیں کہ اس جنگ میں پرتھوی راج کے ساتھ ڈیڑھ سو راجگان ہند کی تین لاکھ فوجیں شامل ہوگئی تھیں جب کہ شہاب الدین غوری کے ہمراہ کل ایک لاکھ بیس ہزار فوج تھی۔ دن بھر گھمسان کی جنگ ہوئی اور شام ہوتے ہوتے شہاب الدین غوری نے یہ عظیم

معرکہ سر کرلیا۔ پرتھوی راج ایک دریا کے کنارے بھاگتے ہوئے گرفتار کرلیا گیا۔ اس طرح حضرت خواجہ کی روحانی سطوت کا دنیا کو اعتراف کرنا پڑا اور ''سلطان الہند'' کا الہامی خطاب ہمیشہ کے لیے خلق خدا کی زبان پر جاری ہوگیا۔

وصال شریف

منقول ہے کہ شب وصال چند اولیاء اللہ نے حبیب کبریا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ کسی کے انتظار میں کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں:

'' رحمت الٰہی کے ہجوم میں آج معین الدین کی روح آنے والی ہے۔ ہم اس کے استقبال کے لیے آئے ہیں۔ ''

۶ رجب المرجب ۶۲۷ھ ہجری بمطابق ۲۱ مئی ۱۲۲۹ء عیسوی بروز دوشنبہ بعد نماز عشاء آپ نے حجرہ شریف کا دروازہ بند کرلیا اور خدام کو اندر داخل ہونے کی ممانعت کردی۔ اس لیے سارے خدام حجرے کے باہر ہی کھڑے رہے۔ رات بھر کانوں میں طرح طرح کی آوازیں آتی رہیں۔ پچھلے پہر آواز موقوف ہوگئی۔ جب نماز صبح کا وقت ہوا اور حجرہ شریف کا دروازہ حسب معمول نہ کھلا تو خدام و معتقدین کو سخت تشویش ہوئی۔ دروازہ توڑ کر دیکھا گیا تو آپ واصل بحق ہوچکے تھے اور جبیں مبارک پر قلم قدرت سے ھذا حبیب اللہ مات فی حب اللہ لکھا ہوا تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

پسماندگان

منقول ہے کہ حضرت خواجہ رضی اللہ عنہ نے بہ ترتیب دو نکاح فرمائے تھے۔ محل اولی سے دو صاحبزادے حضرت خواجہ فخر الدین ابوالخیر، حضرت خواجہ حسام الدین ابوصالح اور ایک صاحبزادی تاج المستورات بی بی حافظ جمال ہیں۔ اور محل ثانیہ سے صرف ایک

صاحبزادہ حضرت خواجہ ضیاء الدین ابوسعید ہیں۔

سرکار خواجہ کی تمام اولاد دین علم وعرفان اور ولایت وتقرب کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہوئیں۔آج بھی ان کے مزارات سے فیوض وبرکات کے چشمے جاری ہیں۔

خواجہ خواجگان چشت اہل بہشت حضور خواجہ غریب نواز کا سلسلۂ طریقت آپ کے خلیفہ اجل اور سجادہ نشیں حضرت قطب الاقطاب سرکار خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رضی اللہ عنہ کے ذریعہ ساری دنیا میں پھیل گیا۔

حضرت خواجہ قطب چودہ سال کی عمر میں بمقام اوس سرکار خواجہ غریب نواز کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے تھے۔

دلوں کا مرکز عشق

کشور ہند میں حضرت خواجہ کا روضۂ پرنور دلوں کا مرکز عشق ہے، جملہ اقطار ارض سے شوق کے قافلوں کا وہ ہر دور میں کعبۂ مقصود رہا ہے۔آج بھی ہندی مسلمانوں کا وہ قبلۂ آرزو ہے۔ بلاتفریق مذہب وملت حضرت خواجہ کے سنگ آستاں پر سب کی گردن عقیدت خم رہی ہے،آج بھی خم ہے اور قیامت تک خم رہے گی۔غریب وامیر، نیک وبد، عالم وجاہل، سالک ومجذوب، حاکم ومحکوم، شاہ وگدا، سرمست وہوشیار........ یکساں طور پر سب کے لیے خواجہ کا آستانہ دل کی تسکین، روح کی کشش اور پیشانیوں کی تسخیر کا گہوارہ رہا ہے۔

مسلم بادشاہوں سے لے کر برطانوی فرماں رواؤں تک سب نے حضرت خواجہ کی عظمت خداداد کے آگے عقیدتوں کا خراج پیش کر کے ان کی معنوی حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت دیا۔

صفحات میں گنجائش نہیں ہے ورنہ کشور ہند کے ایک تاجدار وفرماں روا کی پیشانی پر حضرت خواجہ کے سنگ آستاں کا غبار دکھا کر برصغیر ہند کے حقیقی اقتدار کی نشاندہی کرتا۔

صرف مثال کے طور پر سلطنت مغلیہ کے ایک عظیم فرماں رواشاہجہاں بادشاہ اور اس کی بیٹی شہزادی جہاں آرا بیگم کی رقت انگیز حاضری کا ایک واقعہ نقل کرتا ہوں جسے خود اپنے قلم سے شہزادی نے کتاب ''مونس الارواح'' میں تحریر کیا ہے۔

شہزادی جہاں آراء بیگم کی حاضری

[میں بتاریخ ۸ رشعبان المعظم کو والد بزرگوار کے ہمراہ آگرہ سے اجمیر کے لیے روانہ ہوئی اور ۷ ار رمضان المبارک ۱۰۵۲ھ ہجری کو وہاں پہنچ کر زمیں بوس ہوئی۔ اس تمام عرصے میں میرا معمول یہ رہا کہ ہر منزل پر دو رکعت نماز نفل ادا کرنے کے بعد سورۂ یٰسین اور سورۂ فاتحہ نہایت اخلاص وعقیدت کے ساتھ پڑھ کر اس کا ثواب حضرت خواجہ کی روح اطہر کی نذر کرتی رہی۔ کچھ دنوں تک آنا ساگر کی عمارت میں قیام رہا۔ اس دوران بپاس ادب کبھی پلنگ پر نہیں سوئی اور نہ روضۂ اقدس کی طرف کبھی پاؤں اور پشت کیا۔ دن بھر درختوں کے سائے میں گذار دیتی۔ آنحضرت کی برکت اور اس سرزمین کے فیضان سے قلب وروح میں ایک عجیب وغریب سرور اور ذوق وشوق کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس عظیم الشان نعمت کے شکرانے میں ایک شب میں نے میلادالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل آراستہ کی اور خوب چراغاں کیا۔ روضۂ سرکار کی خدمت وزینت کے لیے جو کچھ ملا اور ملے گا اس میں کمی نہیں کروں گی۔

خدائے برتر کا ہزار ہزار شکر کہ جمعرات کے دن بتاریخ ۲۰ ر رمضان المبارک حضرت پیر دستگیر خواجۂ کونین کے مزار اقدس کی زیارت نصیب ہوئی۔ ایک پہر دن رہ گیا تھا کہ حاضر بارگاہ سعادت پناہ ہوئی۔ گنبد شریف میں حاضر ہو کر دیوانہ وار سات بار مزار پاک کے گرد گھومتی رہی۔ بعدازاں اپنی پلکوں سے جاروب کشی کی سعادت حاصل کی۔ مرقد انور کی خاک وخوشبو کو سرمہ چشم بنایا۔ اس سے دل پر جو ذوق وشوق کی کیفیت طاری ہوئی وہ تحریر

میں نہیں آسکتی۔ غایت شوق کے عالم میں سراسیمہ ہوگئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ خود کو کیا کروں اور کیا کہوں۔ القصہ میں نے قبر شریف پر عطر اپنے ہاتھوں سے ملا اور چادر گل جو میں اپنے سر پر رکھ لائی تھی، مزار شریف پر پیش کیا۔ بعدازاں سنگ مرمر کی مسجد میں آکر نماز ادا کی۔ یہ مسجد دو لاکھ چالیس ہزار روپے صرف کر کے والد بزرگوار (شاہجہاں) نے تعمیر کروائی ہے۔

پھر گنبد مبارک میں بیٹھ کر سورۂ یٰسین و سورۂ فاتحہ کی تلاوت کر کے اس کا ثواب روح پرفتوح کو پیش کیا۔ مغرب تک وہاں حاضری رہی اور آنحضرت کے یہاں شمع روشن کر کے جھالرہ شریف کے پانی سے روزہ افطار کیا۔]

شہزادی جہاں آراء بیگم کی آپ بیتی اور دل کے تاثرات کا یہ حصہ انتہائی رقت انگیز ہے۔ اسے پڑھ کر ایک عجیب سرور حاصل ہوتا ہے۔ امیر کشور ہند کی لاڈلی بیٹی کی ذرا خوش عقیدگی ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتی ہے:

[عجیب شام تھی جو صبح سے بہتر تھی۔ کتنی فرخندہ رات تھی، جس پر کئی بار دن کا اجالا نثار کیا۔ حضرت خواجہ کے جوار میں سپیدۂ سحر نہیں طلوع ہوتا تھا، بلکہ نامرادیوں کے اندھیرے میں فیروز بختی کی کرن پھوٹ پڑتی تھی۔

اگرچہ اس متبرک مقام اور اس گہوارۂ فیض سے گھر واپس آنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر مجبور تھی اگر خود مختار ہوتی تو ہمیشہ اسی گوشۂ جنت میں کہیں اپنا آشیانہ بنالیتی۔ ناچار روتی ہوئی اس درگاہ رحمت سے رخصت ہو کر گھر آئی۔ تمام رات بیقراری میں گذری۔ صبح کو جمعہ کے دن والد بزرگوار کے ہمراہ آگرہ کے لیے روانہ ہوگئی۔]

حضرت احسن العلماء
سید شاہ
مصطفیٰ حیدر احسن میاں

دین و دنیا کی مجھے برکات دے برکات سے
عشق حق دے عشقیِ عشق انتما کے واسطے
حب اہل بیت دے آل محمد کے لیے
کر شہید عشق حمزہ پیشوا کے واسطے

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی

شبستان علم وروحانیت اور بزم فقر وطریقت کی

شمع فروزاں

یہ امر واقعہ ہے کہ مسلک اہلِ سنت کا صحیح ترجمان ہونے کی حیثیت سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کی علمی و دینی شخصیت ساری دنیا کے سنی مسلمانوں کا مرکزِ فکر ہے۔ انہوں نے اپنی گرانقدر تصنیفات کے ذریعہ دین حق کو باطل کی آمیزش سے اس طرح پاک وصاف کر دیا ہے کہ اب ان کی فکر کے ساتھ وابستگی اہلِ حق کی علامت بن گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارے فرقہائے باطلہ کے مقابلہ میں اپنی دینی اور جماعتی شناخت کے لیے ہمارے پاس ''بریلوی'' کے لفظ سے زیادہ جامع اور مختصر کوئی دوسرا لفظ نہیں ہے۔ اللہ و رسول کے دوستوں سے دوستی اور دشمنوں سے علاحدگی یہی مسلکِ اعلیٰ حضرت کی تعبیر ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اعلیٰ حضرت کے سارے علمی اور روحانی کمالات کا منبع مشائخ خانقاہ عالیہ قادریہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ کا وہ سلسلۃ الذہب ہے جو بغداد مقدس سے ہوتا ہوا مدینۃ النبی تک پہنچتا ہے۔ مرکز کا مرکز ہونے کی حیثیت سے برِ صغیر ہند میں مارہرہ مطہرہ کو جو عظمت و شرف حاصل ہے وہ کسی بھی باخبر شخص سے کسی طور مخفی نہیں ہے۔

دورِ اخیر میں سلسلۂ عالیہ قادریہ برکاتیہ کے مشائخ کرام کے صحیح وارث و جانشین کی حیثیت سے حضرت شیخ المشائخ احسن العلماء علامہ سید شاہ مصطفیٰ حیدر حسن میاں صاحب قبلہ علیہ الرحمۃ والرضوان کی شان بہت بلند تھی۔ وہ اس شبستان علم وروحانیت اور بزم فقر وطریقت کی ایسی شمع فروزاں تھے، جس کی روشنی سے بالواسطہ اور بلا واسطہ ہزاروں قلوب منور ہوئے اور لاکھوں خفتگان شب غفلت وضلالت کو سعادت وہدایت کی صبح میسر آتی۔

حضرت کے وصال شریف سے نہ صرف خانقاہ برکاتیہ کی فصل بہار رخصت ہوگئی بلکہ پوری دنیائے سنیت ویران ہوگئی۔ سب سے بڑا ماتم تو اس محرومی کا ہے کہ جماعت اہلِ سنت کے سرپرست کی حیثیت سے اب اکابر کی صف میں کوئی بھی باقی نہیں رہا۔ اب ان کے بعد ہر طرف مایوسیوں کا اندھیرا ہے۔ مولائے قدیر اس عظیم حادثے پر ہمیں صبر جمیل کی توفیق مرحمت فرمائے اور پردۂ غیب سے جماعت کی سالمیت وسلامتی کے لیے کوئی بہتر انتظام فرمائے۔

اس خصوص میں حضرت کی ذات منفرد تھی کہ پیرزادہ ہونے کے باوجود انھیں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی اور حضور مفتی اعظم ہند سے غایت درجہ عشق تھا۔ اعلیٰ حضرت کو جب وہ ''میرے اعلیٰ حضرت'' کہتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ سینہ شق ہوگیا اور اعلیٰ حضرت ان کے دل میں سما گئے۔ وہ فرماتے تھے کہ اعلیٰ حضرت کے ساتھ یہ والہانہ محبت کچھ میرے ہی ساتھ

خاص نہیں ہے بلکہ وہ سنیت اور عشق وایمان کی علامت بن کر میرے پورے خانوادے میں اس طرح گھس گئے ہیں کہ میرے یہاں کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ گھر کی سیدانیوں تک میں ان کا چرچا نہ ہوتا ہو۔

ان کی کوئی محفل ایسی نہیں ہوتی تھی جب کہ مزہ لے لے کر وہ اعلیٰ حضرت اور مفتی اعظم کا تذکرہ نہ کرتے ہوں۔ اپنے بزرگوں کے حالات وواقعات کے تو وہ حافظ تھے۔ ان کی مجلس میں بیٹھتے ہی ہر شخص یہ محسوس کرنے لگتا تھا کہ وہ حال میں نہیں ماضی میں ہے۔ چند لمحے بھی نہیں گزرتے تھے کہ ذکر وفکر کی خوشبو سے پوری فضا معطر ہو جاتی تھی۔ ان کا انداز بیان بھی اتنا والہانہ اور پُرکشش ہوتا تھا کہ دلوں کو چھونے لگتا تھا اور سننے والوں کی آنکھیں فرطِ اثر سے نم ہو جاتی تھیں۔ ان کے سینے میں عہدِ رفتہ کی تاریخ کا ایک ضخیم دفتر محفوظ تھا۔ اب وہ نہیں ہیں تو پچھتاوا ہوتا ہے کہ نصف صدی پر پھیلی ہوئی اپنے اکابر کی تاریخ کا جو انمول خزانہ اپنے ساتھ لے کر چلے گئے اسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر لیا گیا ہوتا تو عالم تصور میں ہم جب چاہتے ماہ ونجوم کی محفلیں سجا لیا کرتے۔

بمبئی سے لے کر راورکیلا اور مارہرہ شریف تک ان کی بارگاہ میں حاضری کی سعادت مجھے بار بار حاصل ہوئی اور ہر بار ان کی نوازش واکرام کی بارش میں ہم بھیگ کر اٹھے۔ کلکتہ سے جب ہم ماہنامہ ''جام نور'' نکالتے تھے تو از راہ حوصلہ افزائی وقدر دانی ان کا حکم تھا کہ ہر ماہ پچیس کاپیاں ان کے پاس بمبئی کے پتے پر ہم ارسال کر دیا کریں۔ دوسرے مہینے میں ان کاپیوں کی قیمت بالالتزام وہ ہمارے پتے پر بصیغہ منی آرڈر ارسال فرما دیا کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ''جام نور'' کا اسلوبِ تحریر اور طرزِ استدلال کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کفر کو تڑپا تڑپا کر قتل کرتا ہے لیکن قلم کی تلوار پر خون کا ایک دھبہ بھی نظر نہیں آتا۔

ایک بار میں صبح کے وقت مارہرہ شریف حاضر ہوا۔ بزرگوں کے کریمانہ اخلاق

اورخردنوازی کے قصے میں نے بارہا کتابوں میں پڑھے تھے، لیکن اس دن پڑھنے کا نہیں بلکہ شرمسار آنکھوں سے مجھے دیکھنے کا موقع ملا۔ انتہائی پُر تکلف ناشتہ سے فارغ کرانے کے بعد انہوں نے مجھ حقیر بے توقیر کو اس مقدس تخت کی زیارت کرائی جس پر اعلیٰ حضرت کے پیرومرشد نے انھیں داخل سلسلہ کیا تھا اور عالم محسوس میں ان کا ہاتھ سرکار غوث الوریٰ کے ہاتھ میں دیا تھا۔ اس کے بعد اپنے بزرگوں کے ان خلوت کدوں میں ہماری حاضری کرائی جہاں سالہا سال کی ریاضت ومجاہدہ کے ذریعہ انہیں سلوک ومعرفت کے مقامات طے کرائے جاتے تھے۔ پھر ہمیں جنت کے اس لالہ زار کی طرف لے گئے جسے ہم جنتیوں کی ابدی آرام گاہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ماتھے کی آنکھیں مزارات کی چادروں سے آگے نہیں بڑھ سکیں........دل کی آنکھ رکھتے تو نور کے لہراتے ہوئے وہ چشمے دیکھ لیتے جس کا سوتا مدینہ کے منبع انوار سے ملتا ہے۔

شرابور ہونے کے لیے الطاف وعنایات کی اتنی ہی بارش بہت تھی اس پر مزید کرم یہ ہوا کہ جب رخصت ہونے لگے تو حضرت نے زبردستی ایک لفافہ میری جیب میں ڈال دیا۔ جب میں نے بہت انکار کیا تو ارشاد فرمایا ''رکھ لیجیے اس خانقاہ کی یہی روایت ہے۔'' باہر جا کر لفافہ کھولا تو اس میں پانچ سو کے نوٹ موجود تھے۔ واپس ہوتے ہوئے راستے بھر میں سوچتا رہا کہ روایت کا مطلب سوا اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ اوپر ہی سے ایسا ہوتا چلا آرہا ہے۔

تخیل کے سہارے ہم اوپر کی طرف بڑھنے لگے۔ سلسلہ کی آخری کڑی تک پہنچے تو ایک آواز کان میں گونجی۔ انما انا قاسم و الله یعطی اللہ عطا کرتا ہے اور میں تقسیم کرتا ہوں۔ اب سمجھ میں آیا کہ یہ گھرانہ ہی تقسیم کرنے والوں کا ہے۔ اپنی زندگی میں بہت خانقاہوں کو ہم نے دیکھا ہے لیکن اس خانقاہ کی یہ ریت دیکھ کر یہ کہنے کو دل چاہتا ہے کہ یہ صرف خانقاہ ہی نہیں بلکہ عصر حاضر کی خانقاہوں کی آبرو بھی ہے۔

آخری زیارت کا شرف مجھے ۲۴ر اگست ۱۹۹۵ء کو حاصل ہوا جب کہ حضرت دہلی کے جی. بی. پنتھ اسپتال میں دل کے آپریشن کے لیے آئی. سی. یو میں صاحب فراش تھے۔ ان کے عالی وقار صاحبزادگان پروفیسر ڈاکٹر سید محمد امین اور سید محمد اشرف اور حضرت کے بھانجے پروفیسر ڈاکٹر سید جمال الدین اسلم کی معیت میں ہم ان کے کیبن میں داخل ہوئے۔ حضرت کے نورانی چہرے پر جیسے ہی نظر پڑی رقت طاری ہوگئی اور ہم آبدیدہ ہوگئے۔ حضرت نے ''کل ہند سنی کانفرنس'' کی کامیابی کے لیے دعا فرمائی جو ۲۶ر اگست کو دہلی کے رام لیلا میدان میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کے بعد حضرت نے اس کمترین کو اپنی دعاؤں اور حوصلہ افزا کلمات سے سرفراز کیا۔

دم رخصت ارشاد فرمایا: مسلک اعلیٰ حضرت پر ڈٹے رہیے!

آج سوچتا ہوں تو کلیجہ پھٹنے لگتا ہے کہ ان کے ایمان کی حس کتنی بیدار تھی کہ موت کا فرشتہ ان کے سرہانے کھڑا تھا اور اس عالم میں بھی انہیں اپنے خاندان کی نہیں صرف مسلک اعلیٰ حضرت کی فکر دامن گیر تھی۔

اعلیٰ حضرت! ناز کرو اپنے مقدر پر کہ تمہارے ''عشق رسول'' کے احترام میں خانوادۂ نبوت کا ایک فرزند جلیل تمہاری یاد کو اپنے کفن میں چھپا کر لے گیا۔ ہزاروں رحمتیں نازل ہوں تم پر بھی اور عالم جاوید کے اس فیروز مند مسافر پر بھی جس کا عشق موت کی ہچکیوں میں بھی زندہ سلامت رہا۔

خاندان برکاتیہ کے باوقار شہزادو اور باحرمت پردہ نشینو! ہم کن لفظوں میں تمہاری دلجوئی کریں کہ یہ غم ہم سب کا مشترک غم ہے۔ آج اہل سنت کی ساری دنیا سوگوار ہے۔ سب کا سینہ یتیمی کے احساس سے زخمی ہے۔ ہم تمہیں پرسہ دیں اور تم ہمیں پرسہ دو اور ہم سب مل کر دعا کریں کہ خداوند حی وقیوم ہمیں صبر دے۔ اور عالم قدس کے پاک طینت مسافر کو اس کے مقدس آباء واجداد کے جوار میں اعزاز واکرام کی جگہ مرحمت فرمائے۔

اخیر میں اس تمنا کا اظہار بھی جماعت کا حق سمجھتا ہوں کہ خانقاہ برکاتیہ کی دینی وروحانی مرکزیت کو اسی روایت وشان کے ساتھ زندہ وباقی رکھا جائے جو سلسلۂ عالیہ برکاتیہ کے قابل تقلید مشائخ کرام کا شیوہ رہا ہے۔

وصلی اللّٰہ تعالی علیٰ خیر خلقه سید نا محمد و آله و صحبه و حزبه اجمعین.

مفتی اعظم ھند
حضرت
مصطفےٰ رضا خاں علیہ الرحمہ

عطا فرمادے ساقی جام نوری
لبا لب جو چہیتوں کو دیا ہے
ثنا لکھنی ہے محبوب خدا کی
خدا ہی جن کی عظمت جانتا ہے
سنا نوریؔ غزل اس کی ثناء میں
ثناء جس کی ثنائے کبریا ہے

نوریؔ بریلوی

مفتی اعظم ھند
ایک عھد ساز شخصیت

تم نے ہر ذرہ میں برپا کر دیئے طوفان شوق
اک تبسم اس قدر جلووں کی طغیانی کے ساتھ

اس عہد کی ایک ایسی نادرالوجود ہستی...... جس کی ہر جان اسیر محبت...... ہر روح سرشار عقیدت...... اور ہر زبان مداح تھی...... اسی کو ہم عام بول چال میں ''مفتی اعظم'' کہتے ہیں۔ دنیائے سنیت کے وہ کروڑہا افراد جو اپنے آپ کو ''بریلوی'' کہتے ہیں، ان میں سے ایک فرد بھی میرے علم میں ایسا نہیں ہے جو مفتی اعظم کے علم وفضل، زہد وتقوی اور ان کی سیادت وبرتری کا معتقد نہ ہو، لیکن فضل وکمال کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ جو لوگ مسلک کی بنیاد پر حضرت مفتی اعظم سے اختلاف رکھتے تھے، وہ بھی ان کے زہد وتقوی، اخلاص وللّٰہیت اور تصلب فی الدین کے معترف تھے۔

پچھلے دنوں ان کی وفات پر ساری دنیا میں حزن والم کا جو رقت انگیز مظاہرہ ہوا اور صرف چھتیس گھنٹے کے اندر جنازے میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے دنیا کے کونے کونے سے بریلی میں بارہ لاکھ عقیدت مندوں کا جو بے مثال ہجوم دیکھنے میں آیا، اس نے دنیا کے مدبرین کو چونکا دیا ہے اور اب بے خبر حلقوں میں ہر طرف یہ سوال اٹھ رہا ہے کہ مفتی اعظم کون تھے؟.........ان کی آفاقی شخصیت پر اتنے دنوں پردہ کیسے پڑا رہ گیا؟

مفتی اعظم کون تھے؟......اس کا سیدھا سادا جواب تو یہ ہے کہ وہ ایک سچے نائب رسول، ایک قدسی صفت بزرگ اور ایک راسخ الاعتقاد مرد مؤمن تھے.......وہ اخلاص ویقین اور عشق ووفا کا ایک پیکر جمیل تھے.......وہ سلف صالحین کی ایک زندۂ وتابندہ روایت تھے.........وہ ائمۂ اسلام اور مشاہیر امت کا نقش حیات تھے.......وہ اولیاء اللہ کی برکت وفیضان کا جلوۂ زیبا تھے.......وہ عقل وعشق، فقر وغنا، علم وعمل اور شریعت وطریقت کے دریاؤں کا سنگم تھے .... وہ غوث الوریٰ کے الطاف وعنایات کا گہوارۂ فیض تھے.........وہ امام ابوحنیفہ کی فکر، امام رازی کی حکمت، امام غزالی کا تصوف اور مولائے روم کا سوز وگداز تھے.........وہ خواجۂ ہند کی شاہانہ سطوت واقتدار کے وارث تھے۔

وہ دینی وقار اور اسلامی غیرت کا ایک ایسا نادر الوجود نمونہ تھے جس کی مثال صرف تاریخ کے اوراق میں ملتی ہے۔آج کے دور میں ان کا کوئی مماثل نظر سے نہیں گزرا۔ ان کی پرنور صورت حقانیت وصداقت کی ایک ایسی روشن کتاب تھی، جسے پڑھ لینے کے بعد دلوں کے دروازے خود بخود کھل جاتے تھے۔

وہ علم وعرفان کا ایک ناپیدا کنار سمندر تھے، جس کی خاموشی سے اس کی گہرائی کا پتہ چلتا تھا.......وہ اسلام وسنیت کا ایک مہکتا ہوا گلشن تھے.......جدھر سے گزرے فضا معطر ہوگئی....... وہ کفر ونفاق کی سیاہ راتوں کے لیے ارشاد وہدایت کا سپیدۂ سحر تھے.........دلوں کے آفاق پر جب بھی وہ طلوع ہوئے فکر واعتقاد کی تاریک وادیوں میں صبح

یقین کا اجالا پھیل گیا۔

جسے چھو دیا شفا مل گئی.........دعا دی تو مقدر سنور گیا.......جہاں قدم رکھا بہار آ گئی........جس جگہ بیٹھ گئے میلہ لگ گیا.....اِدھر نگاہ التفات اٹھی اُدھر مشکلات کی گرہ کھلی.........اِدھر مسکرا کے دیکھا اُدھر کامرانیوں کا سویرا ہوا۔

اہل ایمان کے لیے جگر لالہ کی ٹھنڈک اور منافقین کے سروں پر عمر کی تلوار........سکوت کا عالم ہو تو ایک راز سربستہ ....زبان کھلے تو ہاتف غیب کی آواز.........شریعت پہ آنچ آ جائے تو قہر وجلال کا دہکتا ہوا انگارہ.........اور خود اپنا ناموس خطرے میں پڑے تو توفیق خداوندی پر سجدۂ شکر.........اپنے چھوٹوں کے لیے شفقت مجسم.........اور اپنے بزرگوں کے سامنے سراپا نیاز۔

نہ وہ شعلہ نوا خطیب تھے اور نہ واعظ خوش بیاں، لیکن ان کی ایک خاموشی ہزار تقریروں پر بھاری تھی.........وہ کبھی برکت وفیضان کا ایک بہتا ہوا دریا تھے اور کبھی رحمت وعرفان کا ابلتا ہوا چشمہ.........جب زمین کی وسعتوں میں رواں دواں تھے تو دس لاکھ انسانوں کو عشق مصطفےٰ کا امین بنا دیا...........اور جب علالت کے باعث بریلی میں گوشہ نشیں ہو گئے تو اہل طلب کے جو قافلے خود چشمۂ فیض پر پہنچ کر سیراب ہوئے، ان کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی۔

جب تک وہ سفر کے قابل تھے، اہل سنت کا کوئی بڑا اجتماع ایسا نہیں تھا جسے وہ اپنی شرکت کا اعزاز نہ بخشتے ہوں.........جب وہ اسٹیج پر رونق افروز ہوتے تو مجمع میں بہار آ جاتی.........ہر طرف نور برستا اور ہر چہرہ فرط مسرت سے چمکنے لگتا.........لوگ کانوں سے مقرر کی تقریر سنتے اور آنکھوں سے ان کے رخ زیبا کا نظارہ کرتے۔

دل کو تھاما ان کا دامن تھام کے
میرے دونوں ہاتھ نکلے کام کے

خاص طور پر ان مدارس کے اجلاس میں ضرور شرکت فرماتے، جس کے ذیل میں کسی عظیم عمارت کے سنگ بنیاد کی تقریب منعقد ہوتی۔ اس طرح کے موقع پر سب سے پہلا عطیہ جو چندے کی جھولی میں پڑتا وہ خود مفتی اعظم کی طرف سے ہوتا۔ مدارس کے جلسوں میں حضرت کا معمول یہ تھا کہ وہ مدرسوں سے نہ نذرانہ قبول کرتے اور نہ سفر خرچ۔

اس طرح کے ایک موقعہ کا میں عینی شاہد ہوں، جب مبارکپور کی سرزمین پر الجامعۃ الاشرفیہ کے سنگ بنیاد کی تقریب میں حضور مفتی اعظم ہند مبارک پور تشریف لے گئے۔ بنیاد رکھنے کے بعد جب انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو سارے مجمع پر ایک رقت انگیز کیفیت طاری ہوگئی۔ خود مفتی اعظم ہند کس عالم میں تھے اور وہ دعا کرتے ہوئے کہاں پہنچ گئے تھے، یہ تو خدا ہی کو معلوم ہے، لیکن ہم نے اتنا ضرور دیکھا کہ آنکھیں اشکبار تھیں، ہونٹ شدت کیف سے لرز رہے تھے اور چہرے پر عقدہ کشائی اور نیاز بندگی کی کیفیت کے آثار نمایاں تھے۔

جب آمین پر دعا تمام ہوئی تو ایسا محسوس ہوا کہ الجامعۃ الاشرفیہ کی عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہے اور ہم کھلے آسمان کے نیچے نہیں بلکہ اس کے سائے میں کھڑے ہیں۔ حافظ ملت پر تو ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ فرط مسرت سے ان کی آنکھوں کے آنسو نہیں تھم رہے تھے۔ آج ان کی زندگی کا سب سے بڑا ارمان پورا ہو گیا تھا کہ اہل سنت کی بہبود کے لیے اس صدی کے سب سے بڑے کام کی انہوں نے بنیاد رکھدی تھی۔

تین دنوں تک پورا مبارک پور رنگ ونور میں ڈوبا ہوا خوابوں کا شہر بن گیا تھا۔ حضور مفتی اعظم ہند جب رخصت ہونے لگے تو ہم نے جامعہ کی طرف سے کچھ پیش کرنا چاہا۔ حضرت نے دریافت فرمایا: یہ کیا ہے؟ جلدی میں میرے منہ سے نکل گیا کہ یہ کرایہ ہے۔ حضرت نے فرمایا: میں کرایہ کا مولوی نہیں ہوں۔ اس جواب پر میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ رہ رہ کر پچھتاوا ہوتا تھا کہ یہ کلمہ میرے منہ سے کیوں نکلا، کچھ اور کہہ دیا ہوتا۔

حضرت کے اندر دین کی غیرت اور شریعت کے احترام کا جذبہ اس درجۂ کمال پر تھا کہ زندگی کے کسی بھی مسئلے پر غور کرتے وقت ذہن کا سب سے پہلا تصور یہ ہوتا تھا کہ یہ کام شریعت کے مطابق ہے یا نہیں؟

یہی وہ غیرت اسلامی تھی جس نے مفتی اعظم کو دنیائے سنیت کا تاجدار بنا دیا تھا۔ وہ ایک با اقتدار فرماں روا کی طرح سارے مسلمانوں پر شریعت کے قانون کا نفاذ دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ منظر وہ ہوتا تھا جب وہ کسی مسلمان کو اسلامی شریعت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاتے تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض ادا کرتے وقت وہ چھوٹے بڑے، امیر غریب اور حاکم ومحکوم کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کرتے تھے۔

ان کے دربار کا یہ عام معمول تھا کہ کوئی بڑے سے بڑا رئیس ہو یا اونچے سے اونچے منصب کا افسر، ان کی خدمت میں حاضر ہوتے وقت اگر انگلی میں سونے کی انگوٹھی ہوتی تو وہ فوراً اتروا دیتے اور نہایت شفقت ومحبت کے ساتھ انہیں تلقین فرماتے کہ از روئے شریعت محمدی مردوں کے لیے سونے کا استعمال حرام ہے۔ پھر دل کا کشور فتح کر لینے والے لہجے میں ارشاد فرماتے کہ کوئی گناہ تو لمحے دو لمحے یا گھنٹے دو گھنٹے کا ہوتا ہے، لیکن سونے کی انگوٹھی کا گناہ ایسا گناہ ہے کہ جب تک پہنے رہو مسلسل گناہ ہی گناہ۔

مفتی اعظم ہند کی اسی دینی غیرت اور جلالت حق پرستی کا اثر تھا کہ پوری جماعت میں چند ہی علماء ایسے تھے جو مفتی اعظم کی موجودگی میں تقریر کرنے کے لیے زبان کھول سکتے تھے، ورنہ بڑے بڑے مقررین کو مفتی اعظم کے سامنے تقریر کرتے ہوئے پسینہ آجاتا تھا، کیونکہ منہ سے شریعت کے خلاف جہاں کوئی بات نکلی اور مفتی اعظم نے برسر منبر ٹوک دیا اور اس کے بعد توبہ کی تلقین فرمائی۔ دین کے معاملے میں مفتی اعظم کے اس بے لاگ عمل سے بہت سے لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہوگئیں جو یہ سمجھتے تھے کہ دیوبند کے

ساتھ بریلی کا اختلاف کسی معاصرانہ چشمک یا ذاتی مخاصمت پر مبنی ہے۔ انہوں نے صمیم قلب کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ جو لوگ دین کے معاملے میں اپنے معتقدین، متوسلین اور نیاز مندوں کو نہیں معاف کرتے وہ اہانت رسول کے سوال پر علمائے دیوبند کو کیوں کر معاف کر سکیں گے۔

اور یہ بھی دینی غیرت ہی کی بات تھی کہ مفتی اعظم یہاں کی کچہریوں کو عدالت نہیں کہتے تھے اور جو لوگ وہاں بیٹھتے ہیں ان پر حاکم کے لفظ کا بھی اطلاق نہیں کرتے تھے کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ عدالت کا لفظ اسی دیوان پر بولا جائے گا جہاں اسلامی قانون کے مطابق نزاعات کا فیصلہ کیا جاتا ہو اور جسے خدا اور رسول کی نیابت میں حکومت کا اختیار دیا گیا ہو وہی حاکم کہے جانے کا مستحق ہے۔

اور یہ بھی دینی غیرت ہی کا ایک بے مثال نمونہ ہے کہ وہ بانوے سال کی طویل زندگی میں نہ کبھی کسی سربراہ مملکت کے گھر گئے اور نہ کسی بڑے سے بڑے فرماں روا کے بنگلے میں نظر آئے، بلکہ حیرت میں ڈوب جانے کی بات یہ ہے کہ مملکتوں کے کتنے ہی سربراہوں اور وقت کے کتنے ہی سلاطین نے خود ان کی مجلس میں باریاب ہونے کی اجازت چاہی اور مفتی اعظم نے یہ کہہ کر ملنے سے انکار کر دیا کہ ایک درویش کا بادشاہوں اور ارباب حکومت سے سروکار ہی کیا ہے؟

دہلی ہندوستان کا دل ہے اور سیاسی اقتدار کا مرکز بھی ہے، لیکن کبھی دہلی جانا تو بڑی بات ہے، خود دہلی نے مفتی اعظم کے قریب آنا چاہا تو انہوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔

اور بلا شبہ فقر و استغناء اور خودداری کی شان حضور مفتی اعظم ہند کو اپنے غیور باپ سے ملی تھی، جو اپنے عہد میں اسلام کی جلالت و جبروت کی آخری نشانی تھے۔ جو ساری زندگی خدا کے آگے سجدہ ریز رہے ...... یا پھر مدنی سرکار کی چوکھٹ پر پیشانی خم

ہوئی.......... یا اس سرکار عالی سے جنہیں انعام خسروانہ ملا اور تقرب خاص کی دولت عطا ہوئی، ان کی آقائی کے آگے سر جھکایا۔ اس کے علاوہ کسی بھی بڑے سے بڑے اقتدار کو نہ کبھی خاطر میں لائے اور نہ اس کی طرف احتیاج کا ہاتھ بڑھایا۔

اسی جذبۂ عشق ووفا کی ترنگ میں ایک شعر انہوں نے کہا تھا جو ان کے ضمیر کے اعتقاد اور ان کے باطن کی کیفیت کا آج بھی آئینہ ہے۔

کیسے آقاؤں کا بندہ ہوں رضاؔ
بول بالے میرے سرکاروں کے

☆☆☆

سفر آخرت کا
آنکھوں دیکھا حال

۱۱ر نومبر بدھ کا روز گزار کر ساڑھے تین بجے شب میں ادارۂ شرعیہ بہار پٹنہ کے دفتر میں اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور بجتی رہی یہاں تک کہ گھنٹی کی مسلسل آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ فوراً منشی جی سے دفتر کھلوایا۔ جیسے ہی فون اٹھایا بریلی شریف سے حضرت رحمانی میاں صاحب کے صاحبزادے مولانا توصیف رضا خاں کی بھرائی ہوئی آواز پردۂ سماعت سے ٹکرائی:

"ابھی ایک بجکر چالیس منٹ پر حضور مفتی اعظم ہند کا وصال ہو گیا ہے۔ دنیائے سنیت یتیم ہو گئی۔ ہر طرف گریہ دُرد، آہ و نالہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے والوں سے بریلی کا شہر ماتم کدہ بن گیا ہے۔"

یہ جانکاہ خبر سنتے ہی دل کا حال زیر و زبر ہو گیا....... شعور و احساس پر بجلی گر پڑی....... ہاتھ سے ریسور چھوٹ گیا........ ایسا لگا جیسے تھوڑی دیر کے لیے دل کی دھڑکن رک گئی ہو........ ادارہ کے سارے لوگ جمع ہو گئے .... مولانا رکن الدین اصدق، مولانا ضیاء جالوی........ محمد نور اشرفی اور حافظ عبدالحفیظ صاحب اشرفی کے مشورہ سے پٹنہ ریڈیو اسٹیشن اور اخبارات سے رابطہ قائم کرنے اور بریلی شریف کے سفر کا پروگرام طے پایا۔

دوسرے دن پٹنہ سے سوگواروں کا قافلہ میرے ہمراہ بریلی شریف کے لیے روانہ ہو گیا۔ جمعہ کی صبح کو براہ کانپور ہم لکھنؤ پہنچے۔ پلیٹ فارم پر الہ آباد، پرتاب گڑھ، رائے بریلی اور لکھنؤ کے کئی سو احباب اہل سنت بریلی جانے کے لیے سیالدہ اکسپریس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ سارا مجمع جذبات کے تلاطم سے بے قابو ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سیالدہ اکسپریس آئی۔ دیکھا تو یوپی کے اضلاع کے مخلصین سے پوری ٹرین بھری ہوئی تھی۔ اسی ٹرین سے حضرت عزیز ملت اور مفتی شریف الحق صاحب امجدی کی قیادت میں اشرفیہ مبارکپور کے اساتذہ اور طلبہ کا نورانی قافلہ بھی چل رہا تھا۔

۲ بجے دن کو ہم روتے دھوتے بریلی پہنچے۔ جیسے ہی اسٹیشن سے باہر نکلے معلوم ہوا کہ شہر کے سارے راستے بند ہو گئے ہیں۔ سڑکوں پر تل رکھنے کی جگہ باقی نہیں ہے۔ ملک و بیرون ملک کے طول و عرض سے آنے والے دس لاکھ انسانوں کا سمندر ہر طرف ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ آج نگاہوں کے پردے اٹھا دیئے گئے ہیں اور محبوب رب العالمین کے ایک جاں نثار شیدائی کے اخروی اعزاز اور مقبولیت کا آفتاب سروں پر چمک رہا ہے۔ ہم اور آگے بڑھے تو پولس کے گھوڑ سوار دستے پر نظر پڑی، جو اسٹیشن سے جانے والے مجمع کے سیلاب کو کنٹرول کر رہے تھے۔ بڑی مشکل سے ہم نو محلہ مسجد تک پہنچ سکے۔ یہ مسجد اس میدان کے قریب تھی جہاں تاجدار اہل سنت کی نماز جنازہ ہونے والی تھی۔ آدمیوں کے انبوہ سے مسجد

میں کھڑے ہونے کی جگہ نہیں تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ جمعہ کی نماز مل گئی۔ جمعہ کے بعد ہم لوگ اس میدان کی طرف بڑھے۔ لق ودق میدان میں تا حد نظر لاکھوں آدمیوں کا سیلاب امنڈ پڑا تھا۔ اور پروانوں کی اس سے بڑی تعداد شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ جنازہ کا تین میل لمبا جلوس ابھی راستے ہی میں تھا کہ مشتاقان دید سے سارا میدان بھر گیا۔ آس پاس کی ساری عمارتوں کی چھتوں پر پچاسوں ہزار برقعہ پوش خواتین تاجدار اہل سنت کے جنازہ کے دیدار کے لیے کھڑی تھیں۔

بڑی مشکل سے کئی سو صفوں کو چیرتے پھاڑتے ہم اور علمائے مبارکپور جنازۂ انور تک پہنچے، جو ایک چبوترے پر رکھا ہوا تھا۔ جنازے کے تابوت پر زرد رنگ کی مخملی چادر پڑی ہوئی تھی جو آج لاکھوں شیدائیوں کا مرکز نگاہ تھی۔

تابوت اقدس کے آس پاس اہل سنت کے جو اکابر و مشاہیر ہمیں نظر آئے، ان میں شیخ المشائخ حضرت مولانا سید شاہ مختار اشرف صاحب سجادہ نشیں سرکار کلاں کچھوچھہ مقدسہ، نبیرۂ اعلیٰ حضرت مولانا الحاج ریحان رضا خاں صاحب، نبیرۂ اعلیٰ حضرت مولانا الحاج اختر رضا خاں صاحب ازہری، خاندان کے دیگر شہزادگان و متعلقین، علمائے مبارکپور، علمائے مراد آباد، علمائے جبلپور، علمائے بنارس، علمائے رامپور، علمائے لکھنؤ، علمائے پیلی بھیت، علمائے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علمائے شاہجہاں پور، علمائے سنبھل اور علمائے بہرائچ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

نماز جنازہ حضرت شیخ المشائخ سید مختار اشرف سجادہ نشیں سرکار کلاں کچھوچھہ مقدسہ نے پڑھائی کیونکہ حضور مفتی اعظم ہند کی خواہش تھی کہ کوئی آل رسول ان کے جنازہ کی نماز پڑھائے۔

نماز جنازہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے علاوہ بیرونی ملکوں کے سفراء اور سرکاری و مذہبی نمائندوں نے بھی شرکت کی۔

نماز کے بعد جنازے کا جلوس محلہ سوداگران کی طرف روانہ ہوا جس نے کثرت ہجوم کی وجہ سے چار گھنٹے میں دس منٹ کا راستہ طے کیا۔

خانقاہ عالیہ رضویہ میں حضور مفتی اعظم ہند کے والد بزرگوار اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہما العزیز کے پہلو میں ان کی لحد تیار کی گئی تھی۔ ٹھیک سوا چھ بجے حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمۃ والرضوان کا جسد خاکی لحد میں اتارا گیا۔ چہرے پر نور برس رہا تھا۔ مٹی دینے کے بعد سب سے پہلے اذان دی گئی۔ اس کے بعد صلوٰۃ وسلام پڑھا گیا۔ اخیر میں نبیرۂ اعلیٰ حضرت علامہ اختر رضا خاں ازہری نے ایسی رقت انگیز دعاء مانگی کہ سارا مجمع ڈھاریں مار مار کر رونے لگا۔ اس کے بعد ساری رات اعلیٰ حضرت اور حضور مفتی اعظم ہند قدس سرہما العزیز کے مزار مبارک پر فاتحہ خوانی کا سلسلہ جاری رہا۔

غسل کے وقت کرامت کا ظہور

جمعہ کے دن صبح کے وقت حضرت کو غسل دیا گیا۔ غسل دینے والوں میں مظہر مفتی اعظم حضرت مولانا اختر رضا خاں ازہری، مولانا نعیم اللہ خاں، مولانا عبدالحمید افریقی، قاری امانت رسول پیلی بھیتی اور حاجی فاروق بنارسی کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کا متفقہ بیان ہے کہ غسل دیتے وقت زانوئے مبارک سے جیسے ہی ذرا سا کپڑا کھسکا کہ فوراً حضرت نے اپنی انگشت شہادت اور بیچ والی انگلی سے کپڑا پکڑ لیا اور زانو کا حصہ بے ستر ہونے سے محفوظ رہ گیا۔ عینی شاہدین کی روایت کے مطابق حضرت کی گرفت میں کپڑا اس وقت تک رہا جب تک کہ انگلیوں کی گرفت سے اسے کھینچ نہیں لیا گیا۔ اس واقعہ کو سب لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اطمینان کے ساتھ دیکھا اور اس عقیدے کی سچائی کا مشاہدہ کر لیا کہ اللہ کے ولی اور اس کے مقرب بندے زندہ رہتے ہیں۔

مرض الموت کے عجیب وغریب واقعات

حضرت مفتی اعظم ہند علیہ الرحمۃ والرضوان کی خدمت میں رہنے والے حاضر باشوں نے بتایا کہ ادھر ایک ڈیڑھ ہفتے سے حضرت کی عادت کریمہ یہ ہوگئی تھی کہ ۱۱/بجے رات کے بعد کسی کو اپنے حجرے میں بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ جب سب لوگ باہر نکل جاتے تو صبح ۴/بجے تک ایسی آواز آتی جیسے حضرت کسی کو مرید کررہے ہیں......... کبھی حضرت فرمارہے ہوتے کہ جاؤ تمہارا کام ہوگیا......... کبھی آواز آتی کہ میں نے تمہیں داخل سلسلہ کرلیا......... کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ مصافحہ کرکے کسی کو رخصت کررہے ہیں۔ اس حوالے سے علماء ومشائخ کا قیاس ہے کہ یہ اجنہ اور رجال الغیب تھے جو بیعت وارشاد کے لیے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

÷--÷--÷--

صدر الشریعه

حضرت علامہ حکیم ابو العلی

محمد امجد علی علیہ الرحمہ

مدینے کا مسافر ہند سے پہنچا مدینے میں
قدم رکھنے کی نوبت بھی نہ آئی تھی سفینے میں

قائد اہل سنت علیہ الرحمہ

شہید حجاز

ایک عینی شاھد کی زبانی واقعات کی رقت انگیز تفصیل

میں اپنے اس افتخار کے لیے اپنے مقدر پر ناز کرتا ہوں کہ مرشد برحق حضرت صدرالشریعہ علیہ الرحمۃ والرضوان کے آخری لمحات کا نہ صرف عینی شاہد اور خادم ہوں بلکہ حضرت کا جنازۂ مبارکہ بمبئی سے گھوسی تک پہنچانے کا اعزاز بھی تنہا مجھ ہی کو حاصل ہے۔

واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۴۸ء میں جب ہمارا قیام ناگپور میں مدرسہ شمس العلوم کے صدر مدرس کی حیثیت سے تھا، اچانک ایک دن بمبئی سے حضرت صدرالشریعہ کا ٹیلگرام موصول ہوا کہ تم فوراً بمبئی پہنچو۔

ناگپور سے بمبئی کا سفر صرف بارہ گھنٹے کا تھا۔ اسی دن بمبئی کے لیے روانہ ہوگیا۔ دوسرے دن صبح کے وقت جب میں وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ دھوراجی کے عبدالکریم رحمت

والے میمن کے یہاں قیام ہے جو حضرت کے مرید خاص تھے۔ جب ان کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ حضرت بستر علالت پر ہیں اور غشی کی کیفیت طاری ہے۔ حضرت کی اہلیہ محترمہ جو میری سگی بہن ہیں، وہ بھی حضرت کے ساتھ ہی تھیں۔

تفصیل دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ تاجدار اہل سنت حضور مفتی اعظم ہند اور حضرت صدر الشریعہ، دونوں حضرات بریلی شریف سے اپنی اپنی اہلیہ کے ساتھ حج وزیارت کی نیت سے روانہ ہوئے تھے۔ راستے میں سخت بارش ہوئی اور حضرت صدر الشریعہ کو ٹھنڈک لگ گئی، جس کی وجہ سے بخار آ گیا اور بمبئی پہنچتے پہنچتے حضرت پر نمونیہ کا حملہ ہو گیا۔

بڑی مشکل سے انہیں بمبئی اسٹیشن سے قیام گاہ تک لایا گیا۔ پہنچتے ہی فوراً شہر کے مشہور معالج بلوائے گئے اور ان کا علاج شروع ہو گیا۔ کئی دنوں کے علاج کے بعد افاقہ کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو حضرت کے حکم پر مجھے بمبئی پہنچنے کے لیے ناگپور ٹیلیگرام دلوایا گیا۔ سخت بخار اور نمونیہ کی شدت سے حضرت پر غشی کی کیفیت طاری رہتی تھی، لیکن کبھی کبھی ہوش میں آ جاتے تھے۔ اسی وقفے میں حضرت نے مجھے پہچان لیا اور ارشاد فرمایا کہ اچھا ہوا تم آ گئے۔

مفتی اعظم اور حضرت صدر الشریعہ کا سفر ایک ہی ساتھ بحری جہاز سے طے تھا۔ بمبئی میں مفتی اعظم کا قیام کسی اور جگہ تھا۔ حضرت کی عیادت کے لیے آپ روزانہ تشریف لاتے تھے۔ تاریخ روانگی سے ایک دن قبل بھی ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ ان کی آمد پر عقیدتمندوں کا کافی ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ اسی اثناء میں نعت خوانی شروع ہو گئی۔ جیسے ہی پڑھنے والوں نے اعلیٰ حضرت کی نعت کا یہ مصرعہ پڑھا؛

؎ بھینی سہانی صبح میں ٹھنڈک جگر کی ہے

حضرت صدر الشریعہ نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور فرمایا کہ مجھے تکیہ کے سہارے بیٹھا دو۔ جب تک نعت خوانی ہوتی رہی آنکھیں بند کئے ہوئے حضرت اسی طرح بیٹھے

رہے۔ دوسرے دن ساڑھے بارہ بجے شب میں جہاز کے کھلنے کا وقت تھا۔ سر شام ہی حضور مفتی اعظم بعد نماز مغرب آخری ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ وہ کیفیت تعبیر و بیان کی گرفت میں نہیں آسکتی جو دم رخصت دونوں پر طاری تھی۔ پرنم آنکھوں نے کیا کہا......لرزتے ہوئے ہونٹ کیا کہنا چاہتے تھے......کوئی نہیں سمجھ سکا۔ بس اتنا یاد ہے کہ بھرائی ہوئی آواز میں ایک مریض عشق نے مفتی اعظم کو ان لفظوں میں رخصت کیا:

جایئے! میں بھی پیچھے پیچھے آرہا ہوں........

بالیں سے جدا ہوتے وقت مفتی اعظم کا اضطراب شاید وہاں پہنچ گیا تھا، جہاں سے ایک ہجراں نصیب عاشق نے یہ شعر کہا تھا۔

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھوں
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

ہزار قوت ضبط و تحمل کے باوجود مفتی اعظم اپنی آنکھوں کے آبشار پر کوئی بند نہیں باندھ سکے۔ ان کے نورانی چہرے پر آنسوؤں کا تلاطم دیکھ کر سارا مجمع بے قابو ہو گیا۔ بہت سے لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور گھر کے اندر ایک کہرام برپا ہو گیا۔

مفتی اعظم کے رخصت ہوتے ہی حضرت کی طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ گھبراہٹ کے ساتھ سانس کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ ڈاکٹر بلوائے گئے۔ انہوں نے کئی طرح کے انجکشن دیئے، لیکن سانس کی رفتار میں کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ اچانک ڈاکٹروں نے ناخنوں اور آنکھ کے اندرونی حصوں کا معائنہ کیا اور انتہائی حسرت و یاس کے ساتھ کہا کہ اب حضرت کا آخری وقت آگیا ہے، جو کچھ جسے کہنا سننا ہو کہہ سنائے۔

آثار و قرائن سے جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب حضرت گھڑی دو گھڑی کے مہمان ہیں تو انہوں نے ہمشیرہ مخدومہ کے لیے کمرہ خالی کر دیا۔ جب وہ تشریف لائیں اور حضرت کو اس حال میں دیکھا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اس وقت میرے اور ان کے علاوہ وہاں

کوئی تیسرا شخص نہیں تھا۔ ان کے رونے کی آواز سن کر حضرت نے آنکھیں کھول دیں اور اتنا کہہ کر پھر اپنی آنکھیں بند کرلیں کہ روتی کیوں ہو میں تمہارے ساتھ گھوسی چلوں گا۔

اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی تیز رو مسافر چلتے چلتے اچانک رک جائے اور کچھ کہہ کر پھر اپنے سفر پر روانہ ہو جائے۔ جب ہمشیرہ مخدومہ روتے روتے نڈھال ہو گئیں تو گھر کی عورتیں انہیں سہارا دے کر دوسرے کمرے میں لے گئیں۔

اس کے چند منٹ کے بعد سانس کی رفتار مدھم ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیائے اسلام کا سب سے بڑا فقیہ...... شریعت کا صدر شہیر...... اور طریقت کا بدر منیر......... اپنے لاکھوں شیدائیوں کا روتا بلکتا چھوڑ کر اس سرائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

عین آدھی رات کو سورج ڈوبا اور صبح ہوتے ہوتے ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔

لوگوں نے بتایا کہ ایک عاشق صادق کی بیقرار روح کے پرواز کا وقت بالکل وہی تھا جب سفینۂ حجاز نے بمبئی کے ساحل سے روانگی کا سائرن بجایا تھا۔

حجاز کی مقدس سرزمین پر حضور مفتی اعظم ہند کا ورود مسعود ایک ہفتہ کے بعد ہوا، لیکن ان کا رفیق سفران سے پہلے پہنچ گیا۔

مدینے کا مسافر ہند سے پہنچا مدینے میں
قدم رکھنے کی نوبت بھی نہ آئی تھی سفینے میں

اس حادثۂ فاجعہ کی خبر بجلی کی طرح بمبئی کے طول وعرض میں پھیل گئی۔ جو جہاں تھا وہیں سے خبر کی تحقیق کے لیے چل پڑا۔ صبح ہوتے ہوتے ہزاروں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔ رات ہی کو حضرت کے متوسلین و معتقدین نے اپنے طور پر طے کرلیا تھا کہ حضرت کو بمبئی ہی میں رکھا جائے اور یہیں ان کا نہایت شاندار مقبرہ بنایا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے انہوں نے مناسب جگہ کی تلاش بھی شروع کر دی۔

صبح کو ان لوگوں نے اپنا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہم لوگوں کی اپنی خواہش ہے، لیکن مخدومہ کی رائے معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔ ان کی مرضی معلوم کیے بغیر ہم کچھ نہیں کریں گے۔ رات بھر حضرت مخدومہ کو غشی پر غشی آ رہی تھی۔ وہ اس قابل ہی نہیں تھیں کہ ان سے کوئی بات کی جائے۔ صبح کو کچھ طوفان تھما تو حضرت کے جنازۂ مبارکہ کے متعلق معتقدین کی خواہش سے میں نے انہیں باخبر کیا۔ یہ سنتے ہی وہ ابل پڑیں اور بڑی مشکل سے یہ کہہ سکیں کہ حضرت کا جنازہ ہم اپنے ساتھ گھوسی لے جائیں گے۔ بچوں نے پوچھا کہ ابا میاں کہاں ہیں تو میں کیا جواب دوں گی۔ میں ہرگز اجازت نہیں دوں گی کہ حضرت کو یہاں رکھا جائے۔ اتنا کہنے کے بعد پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

مخدومہ آپا جان کی یہ بات میں نے ان لوگوں تک پہنچا دی۔ بڑی مشکل سے وہ لوگ اس بات کے لیے راضی ہوئے۔ جنازۂ مبارکہ کو بمبئی سے باہر لے جانے کے لیے کئی مراحل طے کرنے تھے۔ پہلا مرحلہ تو ڈاکٹروں سے اجازت حاصل کرنے کا تھا۔ دوسرا مرحلہ کارپوریشن کی اجازت کا تھا اور تیسرا مرحلہ ریلوے سے ریزرویشن کا تھا۔

سب سے پہلے وہ ڈاکٹروں سے سر ٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے گئے۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس شرط پر ہم لاش کو باہر جانے کی اجازت دیں گے کہ پیٹ چاک کر کے اندر کا سارا حصہ ہم نکال دیں گے اور اندر کچھ دوائیں رکھ دیں گے۔

یہ خبر لے کر وہ گھبرائے ہوئے آئے اور مجھ سے کہا کہ مخدومہ سے دریافت کیجیے کہ کیا وہ اس بات کے لیے رضامند ہیں۔ مخدومہ یہ خبر سنتے ہی رونے لگیں اور کہا کہ میں ہرگز اس کے لیے راضی نہیں ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کے بغیر بھی پردۂ غیب سے کوئی صورت ضرور نکلے گی کیونکہ حضرت نے اپنی وفات سے کچھ ہی دیر پہلے مجھے تسلی دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ تم روؤ نہیں، میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ ان لوگوں سے کہو کہ وہ پھر جائیں اور اپنی کوشش جاری رکھیں۔ خدا نے چاہا تو اس کی نوبت

نہیں آئے گی اور کوئی نہ کوئی صورت غیب سے ضرور نکلے گی۔

چنانچہ مخدومہ کے حکم پر وہ لوگ دوبارہ جے جے اسپتال گئے اور اس کے سب سے بڑے ڈاکٹر سے ملاقات کی اور واقعہ کی ضرورت واہمیت سمجھاتے ہوئے اس سے درخواست کی کہ آپریشن کے بغیر لاش کو باہر لے جانے کی کوئی صورت نکل سکتی ہو تو از راہ کرم ہماری مدد کیجئے۔ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اسے حسن اتفاق ہی کہیے یا خدا کی غیبی مدد کہ آج ہی تین دن کے دورے پر امریکہ سے ایک سرجن آیا ہے جو لاشوں کو محفوظ کرنے کے فن میں اکسپرٹ مانا جاتا۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ شاید اس کے پاس کوئی ایسا فارمولا ہو جس میں آپریشن کی ضرورت نہ پڑے۔

تھوڑی دیر کے بعد جب ڈاکٹر واپس آیا تو اس کے چہرے پر کامیابی کی مسکراہٹ تھی۔ اس نے بتایا کہ آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بس اتنا کیجئے کہ جب جنازہ تابوت میں رکھ دیا جائے تو سیل کرنے سے پہلے میرے پاس آجایئے۔ آپ کو چند گولیاں دی جائیں گی، انہیں تابوت میں رکھ دیجئے۔ اس ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اگر باہر کی ہوا تابوت کے اندر داخل نہ ہو تو تین مہینہ تک لاش خراب نہیں ہوگی۔

مخدومہ آپا جان کو جب اس کی اطلاع دی گئی تو وہ سجدۂ شکر میں گر پڑیں اور بے ساختہ کہا کہ یہ حضرت صدر الشریعہ کا کھلا ہوا تصرف ہے۔ پہلا بنیادی مرحلہ طے ہو جانے کے بعد اب کارپوریشن سے اجازت کا مرحلہ باقی تھا، وہ بھی بفضلہ تعالیٰ چند گھنٹوں میں طے ہو گیا۔ اب تیسرا مرحلہ ریلوے کے محکمہ سے تعلق رکھتا تھا۔ سارے کاغذات لے کر جب وہ لوگ اسٹیشن پہنچے تو حسن اتفاق سے بمبئی کے ایک انتہائی بارسوخ شخص سے وہاں ان کی ملاقات ہوگئی، جس کا ریلوے کے حکام پر بہت گہرا اثر تھا۔ اس نے تھوڑی ہی دیر میں کلکتہ بمبئی میل سے مغل سرائے تک سکنڈ کلاس کے دو برتھ ریزرو کروا دیئے اور جنازہ مبارکہ کے تابوت کے لیے ایک دین بھی گھوسی تک کے لیے بک ہو گیا۔

جب وہ لوگ سب کچھ کر کرا کر قیام گاہ پر واپس لوٹے تو غسل کی تیاری ہو رہی تھی ۔ ظہر کے وقت تک تجہیز و تکفین سے لوگ فارغ ہو گئے ۔ ظہر کے بعد ہزاروں عقیدتمندوں کے اصرار پر ایک بہت بڑے میدان میں جنازے کی نماز پڑھی گئی ۔ امامت کے فرائض جمیعتہ علمائے اہل سنت کے سربراہ حضرت مولانا حکیم فضل رحیم صاحب نے انجام دیئے ۔ اس زمانے میں انہیں کے دفتر سے محرم الحرام کے جلسوں کے لیے واعظین ومقررین فراہم کیے جاتے تھے ۔ محرم کے زمانے میں بھنڈی بازار میں واقع ان کا دفتر مسافر خانے میں تبدیل ہو جاتا تھا ۔

کلکتہ بمبئی میل اس وقت نو بجے شب میں بمبئی سنٹرل سے روانہ ہوتا تھا ۔ حضرت کا جنازۂ مبارکہ عصر کی نماز کے بعد قیام گاہ سے ہزاروں عقیدتمندوں کے ہجوم میں اسٹیشن کے لیے روانہ ہوا ۔ راستے بھر تابوت شریف پر گلاب کے پھولوں کی بارش ہوتی رہی ۔ گلاب کی پنکھڑیوں اور ہاروں سے تابوت شریف اس طرح ڈھک گیا تھا کہ تابوت شریف نظر نہیں آتا تھا ۔ نعرہائے تکبیر ورسالت کی گونج میں جنازۂ مبارکہ مغرب کے وقت اسٹیشن پہنچا ۔ مغرب کی نماز پلیٹ فارم پر ادا کی گئی ۔ جیسے ہی تابوت شریف پلیٹ فارم پر رکھا گیا ، ہزاروں کی بھیڑ جمع ہو گئی ۔ مجمع میں بہت سے نعت خواں حضرات بھی موجود تھے ۔ فرط شوق میں انہوں نے نعت خوانی شروع کر دی ۔ اس وقت کا منظر اتنا رقت انگیز ہو گیا تھا کہ لوگ بے قابو ہو گئے اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے ۔ بڑی مشکل سے صلاۃ وسلام کے بعد دیوانوں کا یہ شور تھما ۔

ساڑھے آٹھ بجے شب میں ریلوے حکام نے بریک وین کا دروازہ کھولا اور اس میں تابوت کے رکھنے کی اجازت دی ۔ اجازت ملتے ہی کلمہ طیبہ اور درود وسلام کی گونج میں تابوت شریف اٹھایا گیا اور نہایت ادب واحترام کے ساتھ اس میں رکھ دیا گیا ۔ اس کے بعد ریلوے حکام نے دروازے کو مقفل کر کے سیل کر دیا ۔ بہت سے لوگ پھولوں کا ہار لیے

ہوئے وہاں اس وقت پہنچے جب دروازہ سیل ہو چکا تھا۔ تابوت شریف پر پھول ڈالنے کا موقع نہ مل سکا تو باہر ہی انہوں نے جگہ جگہ پھولوں کے ہار لٹکا دیئے۔ تابوت شریف رکھ دیئے جانے کے بعد ہم اور مخدومہ آپا جان دونوں سکنڈ کلاس کے ایک ریزرو ڈبے میں بیٹھ گئے۔ جب ٹرین کھلی تو نعرہائے تکبیر و رسالت سے سارا پلیٹ فارم گونج اٹھا۔

ہمیں رخصت کرنے کے بعد حضرت کے مریدین و متوسلین نے بمبئی سے لے کر بنارس تک ان تمام بڑے بڑے شہروں میں جہاں ٹرین رکتی تھی، اہل سنت کے علماء وعمائدین کو فون کے ذریعہ مطلع کر دیا کہ حضرت صدر الشریعہ کا جنازۂ مبارکہ کلکتہ بمبئی میل سے آپ کے اسٹیشن سے گزر رہا ہے۔ اطلاع ملتے ہی ہر جگہ اہل سنت کے حلقوں میں اعلان کرا دیا گیا کہ حضرت کے جنازے کا استقبال کرنے کے لیے آپ اسٹیشن پر پہنچیں۔ اس اعلان کے نتیجے میں ہر بڑے اسٹیشن پر بہت بڑی تعداد میں لوگ پہلے ہی سے کھڑے رہے۔ جیسے ہی ہماری ٹرین پہنچتی، لوگ اس ڈبے کی طرف دوڑتے جس میں حضرت کا تابوت شریف رکھا ہوا تھا۔ میں اپنے سکنڈ کلاس کے دروازے پر کھڑا ہو جاتا اور لوگوں سے پھولوں کا ہار اور عطر و گلاب کے تحفے وصول کرتا۔

جب ہماری ٹرین جبل پور پہنچی تو حضرت برہان ملت علامہ مفتی برہان الحق صاحب علیہ الرحمۃ والرضوان جو اس وقت مدھیہ پردیش اسمبلی کے رکن تھے، اپنے سینکڑوں معتقدین و متوسلین کے ساتھ پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ انہوں نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے اسٹیشن ماسٹر کو اس بات کے لیے تیار کر لیا کہ وہ تابوت شریف کے ڈبے کا سیل توڑ کر تابوت شریف پر پھول ڈالنے اور عطر چھڑکنے کا موقع دے۔ چنانچہ وہاں سیل توڑ دی گئی اور لوگوں نے تابوت شریف کی زیارت کی اور اس پر پھولوں کے ہار ڈالے۔ باقی سامان ہمارے حوالہ کر دیا۔

جب ٹرین مغل سرائے پہنچی تو بنارس اور گرد و نواح کے سینکڑوں معتقدین واحباب

وہاں جمع تھے۔ حضرت سے ارادت رکھنے والی کچھ خواتین بھی تھیں۔ لوگوں نے نعرہائے تکبیر ورسالت کی گونج میں بریک وین سے تابوت شریف کو نکالا اور کاندھوں پر اٹھائے ہوئے بنارس جانے والی ٹرین پر لے گئے۔ وہاں حکام پہلے ہی سے موجود تھے۔ تابوت شریف اندر رکھوانے کے بعد دروازہ مقفل کر کے سیل کر دیا گیا۔

جب ہماری گاڑی بنارس پہنچی تو بہت بڑا ہجوم جنازے کے استقبال کے لیے پہلے ہی سے وہاں کھڑا تھا۔ نعرہائے تکبیر ورسالت کی گونج میں لوگوں نے تابوت شریف کو بریک وین سے باہر نکالا اور اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے چھوٹی لائن کے پلیٹ فارم پر لے آئے۔ یہاں گورکھپور جانے والی گاڑی بالکل تیار کھڑی تھی۔ یہاں بھی ریلوے حکام نے بریک وین کا دروازہ کھولا اور تابوت شریف اندر رکھ دیئے جانے کے بعد اسے مقفل کر دیا۔ مخدومہ آپا جان اور ہم سکنڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھ گئے۔ ایک بجے دن کے وقت ہماری ٹرین اندارا جنکشن پہنچی۔ یہاں گھوسی جانے کے لیے ٹرین بدلنی تھی۔ پورا پلیٹ فارم اہل سنت کے علماء، طلبہ اور حضرت کے عقیدتمندوں سے بھرا ہوا تھا۔ جیسے ہی ٹرین پہنچی لوگ بے قابو ہو گئے۔ نعرہائے تکبیر ورسالت کی گونج میں تابوت شریف گورکھپور جانے والی ٹرین سے اتار کر گھوسی جانے والی ٹرین کے بریک وین میں رکھا گیا۔ کچھ خواتین بھی مخدومہ آپا جان کے ساتھ سکنڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھ گئیں۔

گھوسی اسٹیشن پر محشر آلام کا رقت انگیز منظر

جب ہماری ٹرین گھوسی کے اسٹیشن پر پہنچی تو ہر طرف غم زدہ انسانوں کا ایک سیلاب امنڈ رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ ہر طرف نالہ وگریہ کا ایک کہرام بپا تھا۔ حضرت حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کی سربراہی میں دار العلوم اشرفیہ کے سارے اساتذہ، طلبہ اور علاقہ کے علماء اور عوام کے بے قابو ہجوم کو نظم وضبط کی تلقین کر رہے تھے۔

بڑی مشکل سے تابوت شریف کے ڈبے تک جانے کے لیے راستہ بنایا گیا اور حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کو علماء کے مجمع کے ساتھ وہاں پہنچایا گیا۔ ڈبے کا دروازہ کھلتے ہی لوگ جذبات کے تلاطم میں بے قابو ہو گئے۔ حافظ ملت نے علماء کی مدد سے تابوت شریف کو اتارا اور کاندھا دیا۔ اس کے بعد صرف اتنا یاد ہے کہ تابوت شریف کاندھوں اور سروں سے گزرتے ہوئے پروانوں کے سیلاب میں قادری منزل کریم الدین پور کی طرف بڑھتا رہا۔

قادری منزل میں پہلے ہی سے ایک کہرام برپا تھا، جیسے ہی تابوت شریف دروازے پر پہنچا، قیامت کا ایک منظر تھا۔ حج وزیارت سے واپسی پر باپ کے استقبال کی تیاری کرنے والے آج یتیمی کا داغ لیے ہوئے باپ کے جنازے کا استقبال کرنے کے لیے دروازے پر کھڑے تھے۔ قاری رضاء المصطفیٰ جن کی عمر اس وقت تیرہ چودہ برس کے قریب تھی، ان پر تو ایک عجیب دیوانگی کی کیفیت طاری تھی۔ بڑی مشکل سے انہیں قابو میں کیا گیا۔ حضرت کی دو صاحبزادیوں سعیدہ خاتون اور عائشہ خاتون نے جب اپنی غم نصیب ماں کو دیکھا تو روتے روتے ماں بیٹیوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ خاندان کے لوگ بھی غم سے ایسے نڈھال تھے کہ ان کا رونا دیکھا نہیں جاتا تھا۔ بڑی مشکل سے تابوت شریف آنگن میں اتارا گیا۔ جیسے ہی اوپر کا تختہ کھلا ایک عجیب قسم کی خوشبو سے ساری فضا معطر ہو گئی۔ حافظ ملت اور چند مخصوص علماء نے مل کر جنازۂ مبارکہ تابوت سے باہر نکال کر ایک اونچے تختے پر سلا دیا، جو اسی مقصد سے بنایا گیا تھا۔

کفن ہٹا کر پھول جیسے شگفتہ چہرے کا دیدار سب سے پہلے حافظ ملت نے کیا۔ اس کے بعد خاندان کے علماء اور اعزۂ واقارب زیارت سے مشرف ہوئے۔ پرنور چہرہ دیکھنے کے بعد حافظ ملت پر ایسی رقت انگیز کیفیت طاری تھی کہ اسے الفاظ وبیان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ بے خودی کے عالم میں وہ چیخ اٹھے کہ لوگوں میں اعلان کر دو کہ جسے ایک عاشق پاکباز، ایک حق پرست مؤمن اور ایک زندۂ جاوید فقیہہ اسلام کا چہرہ دیکھنا ہو، وہ یہاں آکر

دیکھ لے۔ جب خاندان اور جماعت کے اہم حضرات زیارت سے فارغ ہو چکے تو دیدار عام کے لیے جنازۂ مبارکہ باہر لاکر رکھ دیا گیا۔

یہ روایت بھی باوثوق ذریعہ سے ہم تک پہنچی کہ بہت سے بدعقیدہ لوگ حضرت صدرالشریعہ کا نورانی چہرہ دیکھ کر اپنی بدعقیدگی سے تائب ہوگئے۔ حضرت کی تدفین کے لیے وہی جگہ منتخب کی گئی، جس کی نشاندہی حضرت نے ایک ہفتہ قبل اپنے سفرحج پر روانہ ہوتے وقت فرمائی تھی۔ دیدار عام کے بعد جنازۂ مبارکہ اس باغ میں لے جایا گیا، جہاں پہلے سے قبر شریف تیار تھی۔ حافظ ملت اور خاندان کے مخصوص افراد نے لحد میں حضرت کو اتارا۔ شام ہوتے ہوتے علم وفضل، زہد وتقوی اور مجد وشرف کا تابناک سورج عالم جاوید کے افق کے نیچے ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔

قصبہ گھوسی کے بہت سے لوگ آج بھی اس کے شاہد ہیں کہ دفن ہونے کے بعد بہت دنوں تک قبر شریف سے خوشبو نکلتی تھی، جس سے سارا باغ معطر ہو جاتا تھا۔ تیسرے دن فاتحۂ سوم میں مضافات کے علاوہ دور دور سے لوگ شریک ہوئے۔ ماتم گساروں کے اجتماع میں علماء کرام نے حضرت کی علمی ودینی خدمات اور ان کی مقدس شخصیت پر اپنے گرانقدر تأثرات کا اظہار فرمایا۔

عرس چہلم کے موقع پر ملک کے علاوہ بیرون ملک سے بھی کافی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ جو شریک نہ ہو سکے انہوں نے اپنے پیغامات ارسال کئے۔ محدث اعظم پاکستان حضرت علامہ مفتی سردار احمد صاحب علیہ الرحمۃ والرضوان کا تعزیتی مکتوب اتنا دلدوز اور رقت انگیز تھا کہ پڑھتے وقت پڑھنے والا بھی اشکبار تھا اور سننے والے بھی اشکبار تھے۔

چہلم شریف کے بعد سال بھر تک اہل سنت کے مشاہیر واکابر علماء فاتحہ خوانی کے لیے تشریف لاتے رہے۔ یکم اور دو ذی القعدہ کو حضرت کا سالانہ عرس شریف خلف اکبر محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ صاحب سجادہ نشین آستانۂ قادریہ رضویہ امجدیہ کی سربراہی میں

نہایت تزک واحتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے، جواب ایک علمی اورفکری تقریب کی صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔ علمائے اہل سنت کی موجودہ نسل میں شارح بخاری حضرت علامہ مفتی شریف الحق صاحب امجدی کی شخصیت میر کارواں کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ خانوادۂ امجدیہ میں بھی بزرگانہ شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کی سرپرستی میں عرس امجدی کی تقریب اب اہل علم کی دلچسپیوں کا مرکز توجہ بنتی جارہی ہے۔

استاذ الاساتذہ جامع معقولات حضرت مولانا حافظ عبدالرؤف صاحب بلیاوی علیہ الرحمہ نے کافی جدوجہد کے بعد حضرت کے روضۂ مبارک کی نہایت شاندار عمارت بنوائی ہے۔ اب حضرت مولانا عبدالشکور صاحب اعظمی اوران کے رفقاء کار نے اس کی تعمیر جدید کے لیے ایک عظیم الشان منصوبہ تیار کیا ہے۔ خدا کرے وہ پایۂ تکمیل کو پہنچے اور حضرت صدرالشریعہ کے روحانی اور علمی فیض کا چشمہ اسی طرح جاری رہے۔

غزالیٔ دوراں علامہ

سید

احمد سعید کاظمی علیہ الرحمہ

ابر رحمت ان کے مرقد پر گہر باری کرے
حشر تک شان کریمی ناز برداری کرے

ایک عبقری شخصیت

خدا کا شکر ہے کہ مجھے غزالی دوراں حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی علیہ الرحمۃ والرضوان کی زیارت سے مشرف ہونے کا متعدد بار موقع ملا۔ پہلی بار حضرت علامہ شاہ احمد نورانی کے دولتکدے پر اس تاریخی اجتماع میں ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا جس میں ''دعوت اسلامی'' کے نام سے اہل سنت کے ایک تبلیغی اور اصلاحی جماعت کی بنیاد رکھی گئی۔ اور جس میں پاکستان کے اکثر اکابر اہل سنت تشریف فرما تھے۔ ان کے سامنے مجھے ''دعوت اسلامی'' کا لائحہ عمل پیش کرنا تھا۔ جسے میں نے استاذ العلماء حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ ازہری، بحر العلوم حضرت علامہ مفتی وقار الدین رضوی اور رئیس الافاضل حضرت علامہ مفتی ظفر علی نعمانی کے اصرار پر مرتب کیا تھا۔ مفتی صاحب موصوف کی نظر میں لائحہ عمل کی اتنی

زبردست اہمیت تھی کہ انہوں نے مجھے اس کام کی تکمیل کے لیے دارالعلوم امجدیہ کے ایک کمرے میں کئی دنوں تک نظر بند کر دیا تھا۔

دوسری بار دارالعلوم امجدیہ ہی کی ایک تقریب میں ان کی ملاقات سے شادکام ہوا اور اسی موقعہ پر علم وحکمت اور عشق وعرفان سے معموران کی تقریر منیر سننے کا بھی شرف حاصل ہوا۔ چند بار کی ملاقاتوں میں ان کے علم وفضل، ان کے اخلاص وتقوی، ان کے زہد وتقدس اوران کی دلنواز اداؤں سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔

لیکن صحیح طور پران کی علمی جلالت وجبروت کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں جامعہ مدینۃ الاسلام ڈین ہاگ کے جلسۂ دستار بندی میں شرکت کے لیے ہالینڈ گیا اور جامعہ کے استاذ حضرت مولانا حافظ قاری خیر محمد چشتی ازہری نے مجھ سے اصرار فرمایا کہ میں حضرت غزالئ دوراں سے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کردوں تاکہ ''لمعات کاظمی'' کے نام سے جو عظیم الشان کتاب ان کے عزیز القدر حضرت مولانا جمیل الرحمٰن صاحب سعیدی رضوی سلمہ شائع کررہے ہیں، اس میں میرا مضمون بھی شامل کردیا جائے۔

اپنے تاثرات قلمبند کرنے کے لیے مواد کی تلاش میں جب میں نے حضرت غزالئ دوراں کے علمی مضامین کا مطالعہ شروع کیا جو ''مقالات کاظمی'' کے نام سے تین ضخیم جلدوں میں مکتبہ فریدیہ ساہیوال نے شائع کیا ہے، تو حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اندر سے میرا ضمیر چیخ اٹھا کہ ''غزالئ دوراں'' کا لقب ان کی عبقری شخصیت کے لیے بالکل الہامی ہے۔

ان کے مقالات کا مطالعہ کرنے کے بعد میں حیران ہوں کہ کس کس رخ سے ان کے جلوؤں کا تماشہ دیکھوں اور کدھر کدھر انگلیوں کا اشارہ کروں کہ علم وحکمت کا نگار خانہ یہاں ہے......چلمن اٹھاؤ......ورق الٹو......اور آنکھوں کے پٹ کھولو!......اور کہاں کہاں مجد وشرف کے بیان کے لیے میں بلبل ہزار داستان کی زبان مستعار لوں......کیسے

یہ منظر دکھاؤں کہ قلم کی نوک سے بھی شہر بسایا جاتا ہے......سنگ وخشت کا نہیں، علم ودانش کا شہر......وہ شہر جس کا دروازہ فاتح باب خیبر ہیں......جس طرف نگاہ اٹھایئے حقائق ومعانی کے گل بوٹے کھلے ہوئے ہیں......اور جس صفحے پر نظر ڈالیے علوم ومعارف کے دفاتر کھلے ہوئے ہیں......جس مسئلے پر بھی قلم اٹھ گیا ہے بحث کا ہر گوشہ دوپہر کی دھوپ میں ہے......اور علم وفن کی جس وادی میں بھی قدم رکھ دیا ہے اس کے کناروں تک پہنچ گئے ہیں............راہرو کی طرح نہیں میر کارواں کی طرح۔

ہر فن میں مہارت ورسوخ اور اس کے جزئیات کا استحضار کی بات تو اپنی جگہ پر ہے، سب سے بڑا فضل خداوندی تو یہ ہے کہ فلک پیما جولانی فکر اور بے پایاں ذہانت کے باوجود رائے کسی مسئلے میں بھی طغیانی وسرکشی کا شکار نہیں ہے۔ قدم اسی جادۂ حق پر ہے جہاں امت کے اسلاف کھڑے ہیں۔ قوت فکر اور ذہانت پر نہ کسی طبقے کی اجارہ داری ہے اور نہ کسی فرد کی، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ذہین آدمی حق وصواب کی منزل بھی پالے۔ نصیبے کی یہ فیروزمندی صرف انہی مردان حق کے حصہ میں آتی ہے جو فکر وتحقیق کی منزل میں اس کاروان ہدایت کے نشان قدم کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، جس کی طرف **صراط الذین انعمت علیھم** میں قرآن نے اشارہ کیا ہے۔

وذلک فضل الله یوتیه من یشاء۔

تاریخ میں ایسے لوگوں کی بڑی طویل فہرست ہے جنہیں بے مہار عقل اور بے توفیق ذہانت نے جہنم کے دروازے تک پہنچادیا...... ایک مؤمن کے لیے ذہانت وقابلیت بہت بڑی نعمت ہے، اگر دل پر توفیق الٰہی کا پہرہ ہو......اور بہت بڑا عذاب بھی ہے اگر توفیق الٰہی ساتھ چھوڑ دے۔

بلاشبہ حضرت غزالئ دوراں کا بیکراں علم ان کے لیے حجاب اکبر نہیں بن سکا کیونکہ علم وفن کی جلالت وجبروت کے ساتھ انہیں پہلو میں عجز ومسکنت کا ایک ٹوٹا ہوا دل بھی

ملا تھا، جو خشیت و عشق کی حرارت سے ہر وقت تپتا رہتا تھا۔ ویسے فراوانی علم و عقل کے ساتھ نفس کی نخوت کا پیوند ہمیشہ جوڑا گیا ہے، لیکن غزالئ دوراں کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ ان کا نفس تو اسی دن اپنی موت مر گیا جس دن وہ اپنے برادر معظم کے دست حق پرست پر مرید ہوئے اور دل کی پوری بشاشت کے ساتھ اپنے پورے وجود کو بھائی کی غلامی دیدیا۔ دنیا میں اس کی مثال بہت کم ملے گی کہ کسی نے اپنے بھائی کی عظمتوں کا اعتراف اس طرح ٹوٹ کر کیا ہو......... بجز اس کے کہ نفس کی شرارت سے خدا نے اسے محفوظ کر دیا ہو۔

اس میں قطعی دو رائے نہیں ہے کہ حضرت غزالئ دوراں مختلف اصناف کے محاسن و کمالات کے جامع ہونے کی حیثیت سے ایک نادر الوجود شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنے عہد کے بے مثال محقق بھی تھے......... بے نظیر خطیب بھی تھے......... اور یگانۂ روزگار مدرس بھی......... اسی کے ساتھ اردو ادب میں وہ ایک ایسی زبان کے موجد بھی تھے جسے انہوں نے عربی درسگاہوں، دار الافتاؤں، صحافیوں اور خطیبوں کی زبانوں کے امتزاج سے تیار کی تھی......... یہی وجہ ہے کہ ان کے مقالات پڑھتے ہوئے قاری انہیں کئی روپ میں دیکھتا ہے......... جب کبھی وہ فتوے کی زبان میں بات کرتے ہیں تو الفاظ چیخنے لگتے ہیں کہ ایک فقیہ بول رہا ہے......... اور جب کسی علمی مسئلے پر قلم اٹھاتے ہیں تو درسگاہ کی زبان کا وقار دیکھنے کے قابل ہوتا ہے......... لیکن جب قومی اور ملکی مسائل پر اظہار خیال فرماتے ہیں تو انداز تحریر اچانک ایک صحافی کے پیرایۂ بیان میں تبدیل ہو جاتا ہے......... اور جب دعوت و تذکیر اور اصلاح و تبلیغ کی مسند سے بات کرتے ہیں تو سطر سطر سے ایک خطیب و داعی کا رنگ جھلکتا ہے......... تحریر کی اسی بوقلمونی اور قلم کی اسی نیرنگی نے مقالے کی زبان کو رنگا رنگ پھولوں کے گلدستہ کی طرح خوبصورت بنا دیا ہے۔

علاوہ ازیں تعبیرات اور اسلوب بیان پر انہیں اتنی قدرت حاصل ہے کہ پیچیدہ سے پیچیدہ علمی حقائق کو بھی نہایت حسن و خوبی کے ساتھ وہ عوام کے ذہنوں میں اتار دیتے

ہیں۔اپنی فکر کی سطح مرتفع سے نیچے اتر کر عوامی ذہن کی سطح سے بات کرتے ہوئے ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ علمی وقار مجروح نہ ہو جائے ،لیکن غزالئی دوراں کا انداز تفہیم اتنا متوازن ہے کہ ذرا بھی محسوس نہیں ہوتا کہ کون نیچے اترا اور کسے اوپر اٹھایا گیا۔

اس سلسلے میں ''مقالات کاظمی'' سے بطور شواہد کے میں چند مقامات کی نشاندہی کرتا ہوں۔

ا۔ مسئلہ معراج پر فلاسفہ کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے ایک جگہ یہ ذیلی سرخی قائم کرتے ہیں۔

معراج شریف کا محال ہونا ہی اس کے واقع ہونے کی دلیل ہے۔

یہ فقرہ ضرب المثل بنانے کے قابل ہے۔ سنتے تھے کہ اجتماع ضدین محال ہے لیکن سر دھنیے کہ کس خوبصورتی کے ساتھ انہوں نے جمع کر کے دکھلا دیا۔ ایک ہی فقرے سے یونانی فلسفہ کا سارا غرور خاک میں مل گیا۔کون ثابت کر سکتا ہے کہ محال بھی واقع ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کی تربت پر عقیدتوں کے پھول برسایئے کہ انہوں نے ثابت کر کے دکھا دیا۔

ارشاد فرماتے ہیں:

اگر فلاسفہ معراج شریف کے محال ہونے پر دلائل نہ قائم کرتے تو ہمارا مدعا ثابت نہ ہوتا،اس لیے کہ ہم معراج کو حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا معجزہ کہتے ہیں اور معجزہ وہی ہے جس کا واقع ہونا عادۃ محال ہو۔

یہ علامہ ہی کا کمال فن ہے کہ چند سطروں میں ''عقائد نسفی'' اور ''شمس بازغہ'' دونوں کو ہم بھی کیا اور الگ بھی کیا............جو مباحث سینکڑوں صفحات میں پھیلے ہوئے ہوں انہیں چند سطروں میں سمیٹ لینا تفہیم و تعبیر کا سب سے بڑا کمال ہے۔

اسی طرح ''شق صدر'' کے واقعہ سے غزالئی دوراں نے حیاۃ النبی پر جس دل نشیں

ا۔ مقالات کاظمی، ج:ا، ص:۱۳۲

پیرائے میں استدلال فرمایا ہے، وہ مقام بھی اہل علم کے لیے قابل دید ہے۔
ارشاد فرماتے ہیں:

روح حیات کا مستقر قلب انسانی ہے۔ لہذا جب کسی انسان کا دل اس کے سینہ سے باہر نکال لیا جائے تو وہ زندہ نہیں رہتا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک سینہ اقدس سے باہر نکالا گیا، پھر اسے شگاف دیا گیا اور وہ منجمد خون جو جسمانی اعتبار سے دل کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے، صاف کر دیا گیا، اس کے باوجود بھی حضور علیہ الصلاۃ والسلام بدستور زندہ رہے، جو اس امر کی روشن دلیل ہے کہ روح مبارک کے قبض کے بعد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں۔

استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ چار بار قبض روح کے بعد جس کا زندہ رہنا مشاہدہ سے ثابت ہے، اب پانچویں بار بھی قبض روح کے بعد وہ زندہ ہو تو اس سے انکار کی معقول وجہ کیا ہے؟ کیا چار بار کا مشاہدہ اس زندگی کے یقین کے لیے کافی نہیں ہے جس کا آج ہم مشاہدہ کرنے سے قاصر ہیں۔

اس طرح کے بیش قیمت جواہرات پوری کتاب میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اگر انہیں ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو آج کے اختلافی مسائل میں مذہب اہل سنت کا ایک نیا علم کلام منظر عام پر آجائے۔ جامعہ مدینۃ الاسلام کی مصروفیات اگر حائل نہ ہوتیں تو حضرت غزالئی دوراں کے یہ علمی خزائن اس امر کے متقاضی تھے کہ انہیں چن چن کر ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ ان کی علمی افادیت تو اپنی جگہ پر ہے، سب سے بڑا فائدہ تو یہ متصور ہے کہ اہل سنت کی نئی نسل بحث و استدلال کے ایک ایسے فن سے واقف ہو جائے گی جسے علامہ

۱۔ مقالات کاظمی، ج:۱، ص:۱۴۲

کاظمی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے اور اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔

زندگی نے وفا کی اور توفیق الٰہی شریک حال رہی تو اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا عزم کرلیا ہے۔ قارئین کرام دوسری قسط کا انتظار فرمائیں۔

﴿☆☆☆☆﴾

﴿☆☆﴾

﴿☆﴾

مذہبی دنیا میں ایک صحت مند انقلاب کا داعی

ملت کا ترجمان

جام نور دھلی

کا مطالعہ کیجئے

مستقل مضامین

اداریہ ملت اسلامیہ کی پر خلوص رہنمائی

پس منظر عصری اسلوب میں فکر اسلامی

تحریری مباحثہ حالات حاضرہ پر مشاہیر امت کے افکار

فکر ونظر قارئین کے خیالات

روبرو سر کردہ اسلامی شخصیت سے گفتگو

جہان ادب ادبی شاہکار

تعاقب اردو رسائل پر تبصرہ

اور وہ سب کچھ جو آپ کی مذہبی دنیا میں انقلاب برپا کر دے

رابطہ کا پتہ:

مکتبہ جام نور ۴۲۲ مٹیا محل جامع مسجد دہلی ٦

قطب مدینہ
حضرت مولانا شاہ
ضیاء الدین احمد مدنی قادری قدس سرہ

ناصحا تجھ کو خبر کیا کہ محبت کیا ہے
روز آجاتا ہے سمجھاتا ہے یوں ہے یوں ہے

وسیم بریلوی

قطب مدینہ کا سفر آخرت

ایک عینی شاہد کی زبانی

بروایت مولانا ابوالقاسم ضیائی

اعلیٰ حضرت امام اہل سنت کے مرید رشید وسعید اور خلیفہ اجل قطب مدینہ، شیخ العرب والعجم حضرت مولانا الحاج شاہ ضیاء الدین احمد قادری رضوی قدس اللہ سرہما العزیز نے خاص مدینۃ النبی میں ۷ ذی الحجہ کو جمعہ کے دن عین اذان کے وقت کلمۂ حی علی الفلاح پر داعی اجل کو لبیک کہا۔

۴۰ برس کی عمر شریف میں آپ نے ہندوستان سے ہجرت فرمائی اور مدینہ امینہ میں جا کر بس گئے۔ مدینہ طیبہ کے دوران قیام آپ نے ستر حج کیے۔ ادھر دس سالوں سے آپ مدینہ پاک میں اس طرح گوشہ نشین ہو گئے تھے کہ ایک دن کے لیے بھی کبھی مدینہ سے باہر نہیں نکلے، کیونکہ آپ کی زندگی کی سب سے قیمتی آرزو تھی کہ جب پیام اجل لیکر موت کا

فرشتہ آپ کے پاس آئے تو آپ مدینہ میں اسے ملیں۔ اسی اندیشے کے پیش نظر آپ نے دس سال سے یکلخت اپنا سفر بند کر دیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مدینہ کے باہر موت آجائے۔

اور خدا کا شکر ہے کہ بالآخر ایک عاشق صادق اور ایک وارفتۂ محبت کی یہ آرزو پوری ہوئی اور مدینہ میں موت بھی آئی تو اس شان سے آئی کہ ادھر مسجد نبوی شریف کے مینار سے خدا کے منادی نے آواز دی " حی علی الفلاح " یعنی کامرانی کی طرف آؤ ادھر عاشق پاکباز کی روح نے جسد عنصری سے پرواز کیا۔ پکارا کے جواب میں ذرا بھی تاخیر نہیں ہوئی کیونکہ پکارنے والے نے جہاں سے پکارا تھا وہی اس کی زندگی کی آخری منزل تھی۔

تمنا ہے درختوں پہ ترے روضہ کے جا بیٹھوں
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

مدینۃ النبی میں حضرت شیخ کی خانقاہ عشق وعقیدت اور عرفان واتقان کی ایک ایسی آفاقی تربیت گاہ تھی جہاں روئے زمین کے سارے خطوں سے اہل شوق کے قافلے اترتے تھے............دلوں کی سرزمین پر بادل کی طرح فیضان کی بارش ہوتی تھی............ مایوس روحوں کے آفاق پر صبح امید کا اجالا پھیلتا تھا.........اور حب رسول کے کیف میں ڈوبا ہوا ماحول اندر سے لے کر باہر تک روح وتن کی پوری بستی کو مہکا دیتا تھا۔

موسم حج کے موقعہ پر توان کے میکدۂ عشق وعرفان میں بہار آجاتی تھی........... صبح سے شام اور شام سے رات گئے تک ہر وقت بادہ کشوں کا ہجوم لگا رہتا تھا.......ذکر الٰہی، تلاوت قرآن اور نغمہائے نعت اور صلاۃ وسلام کے ترنم سے پوری فضا معطر رہتی تھی.........سرور ومستی کے عالم میں کبھی آنکھوں کے پیمانے چھلکتے.........کبھی محفل سے نالہ وفغاں کی چیخ بلند ہوتی..........کبھی یارسول اللہ کی ضرب سے دل کی گرہیں کھلتیں

.........اور کبھی ساقی کی نگاہ التفات اٹھتی تو روحوں کے دامن سے جنم جنم کا غبار دھل جاتا۔

نجدی حکومت کے جبری ماحول میں رہتے ہوئے بھی وہ اپنے جذبۂ عقیدت کے مظاہرہ میں بالکل آزاد تھے۔ان کی خانقاہ کا سارا ہنگامۂ شوق، عشق وعرفان کی ساری سرمستی اور قلب وروح کی تطہیر وتنویر کا سارا عمل نجد کے قاضیوں کے نزدیک شرک ہی شرک تھا،لیکن اسے مدنی سرکار ہی کا تصرف کہیے کہ جبر واستبداد کی بنیاد پر اپنے مذہب کا کاروبار چلانے والی حکومت کبھی ان کے راستے میں حائل نہ ہوسکی یا پھر یوں کہیے کہ تاجدار حرم اور شہریار ارم نے اپنے ایک وفا کیش دیوانے کو اپنی رحمتوں کے حصار میں کچھ اس طرح چھپا لیا تھا کہ کسی گستاخ کا ہاتھ وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکا۔

حضرت قطب مدینہ کو بریلی سے جو والہانہ محبت تھی اس کے اظہار میں کبھی انہوں نے اس اندیشے کی پرواہ نہیں کی کہ سعودی عرب کے نجدی حکمراں بریلی کا نام سن کر سلگ جاتے ہیں۔اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی عقیدت میں ان کی خانقاہ کا ماحول ہر وقت بھیگا رہتا تھا۔مدینے کی کوئی صبح یا کوئی شام ایسی نہیں تھی جب کہ ان کے گھر سے حدائق بخشش کے نغموں کی آواز نہ سنائی دیتی ہو.....اور اعلیٰ حضرت کی وہ مشہور زمانہ نعت جو چار زبانوں پر مشتمل ہے اور جسے لوگ مردہ دلوں اور بے کیف روحوں کا مسیحا کہتے ہیں،جس کی ابتداء یوں ہے :

لم یأت نظیرک فی نظر مثل تو نہ شد پیدا جانا

جگ راج کو تاج تورے سر سوہے تجھکو شہ دوسرا جانا

البحر علی والموج طغی من بیکس وطوفاں ہوش ربا

منجدھار میں ہوں بگڑی ہے ہوا موری نیا پار لگا جانا

یہ تو آج بھی مدینہ کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے.......اور اسے بارگاہ رسالت میں اعزاز قبول کی سند ہی کہیے کہ یہ قصیدۂ جاں نواز حضرت شیخ کی محفل سے ٹیپ ہوکر مدینے کے

بازار میں پہنچا اور وہاں سے کیسٹ کے ذریعہ ساری دنیا میں پھیل گیا۔

اب مدینہ کا سب سے قیمتی تحفہ جو حاجی اپنے ساتھ لے کر آتا ہے اور دلوں کو حب رسول کی تپش سے گرم رکھتا ہے وہ اعلیٰ حضرت کا یہی قصیدۂ نعتیہ ہے جسے ایک انچ کے چوڑے فیتے نے اپنے سینے میں جذب کر لیا ہے۔

جگر گوشۂ اعلیٰ حضرت تاجدار اہل سنت مفتی اعظم ہند علیہ الرحمۃ والرضوان کو کئی بار حبیب کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ مدینۃ النبی میں اکثر آپ کا قیام حضرت شیخ ہی کے دولت کدہ پر ہوتا تھا۔ مفتی اعظم ہند کی خداداد محبوبیت، بارگاہ رسالت میں ان کا مقام تقرب اور علم و فضل، زہد و تقویٰ اور مدارج ولایت میں ان کی برتری کا نظارہ اس وقت دیکھنے میں آتا تھا جب کہ حضرت شیخ کے گھر وہ مہمان ہوتے تھے۔

ملک ملک کے علماء و عمائدین، بلاد عرب کے مشائخ کبار اور بڑے بڑے اساطین ملت بزم میں جلوہ گر ہوتے اور مفتی اعظم شہ نشیں میں بیٹھتے .... برکت و فیض کی نعمت تقسیم فرماتے .... کوئی حدیث و تفسیر اور دوسرے علوم و فنون کی سند طلب کرتا .... کوئی سلسلہ عالیہ قادریہ رضویہ کی اجازت کی درخواست کرتا .... کوئی اپنے ملک کے کسی نہایت پیچیدہ مسئلے میں حضرت سے استفتاء کرتا .... اور حضرت شمع محفل کی طرح اپنے پروانوں کے ہجوم میں خود بھی روشن ہوتے اور دوسروں کو بھی روشن کرتے۔

حضرت شیخ کی متوکلانہ زندگی، زہد و تقویٰ، علم و فضل، ولولۂ تبلیغ و ارشاد، امت کا درد، دینی اخلاص، ریاضت و مجاہدہ، بارگاہ رسالت میں تقرب خاص اور باطنی کمالات کی بنیادوں پر دنیائے اسلام کے علمائے مشاہیر اور مشائخ کبار انہیں "قطب مدینہ" کہتے تھے۔ اب وصال شریف کے موقع پر جن عجیب و غریب واقعات کا ظہور ہوا ہے، ان سے اس عقیدے کو مزید تقویت حاصل ہو گئی ہے۔

وصال شریف کے وقت کے عینی شاہد اور حضرت شیخ کے خادم خاص جناب ابوالقاسم صاحب قادری ضیائی نے اپنے خط میں جو واقعات تحریر فرمائے ہیں، وہ انتہائی پر اسرار، ایمان افروز اور رقت انگیز ہیں۔

راوی کا بیان ہے کہ وصال شریف کے ایک ہفتہ قبل ہی سے حضرت پر استغراقی کیفیت طاری رہنے لگی تھی، لیکن اس حالت میں بھی کوئی نماز قضاء نہیں ہوئی۔ جمعرات کا دن گزار کر شب میں عجیب وغریب واقعات کا ظہور ہوا۔ رات ڈھل جانے کے بعد حضرت اپنے اردگرد بیٹھنے والوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے ارشاد فرمایا:

"ہمارے مشائخ کرام تشریف لارہے ہیں۔"

پھر تھوڑی دیر کے بعد زبان کھلی اور حکم ہوا:

"مؤدب ہوجاؤ کہ سرکار غوث الوریٰ جلوہ فرما ہونے والے ہیں...... حضور تشریف لائیے...... اپنے غلام کی دستگیری فرمایئے۔"

پھر کچھ دیر کے بعد متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا:

"حضرت خضر علیہ السلام کے لیے جگہ خالی کرو...... وہ ایک مسکین بندے کو عرفان وایقان کے جلووں سے سرفراز کرنے آرہے ہیں۔"

پھر کچھ ہی وقفہ گزرا تھا کہ ایک نہایت رقت انگیز اور دھیمی آواز کان میں آئی جب کہ آنکھیں اشکبار تھیں اور چہرے پر مسرت کی روشنی چمک رہی تھی۔

"حضور! نقاہت کی وجہ سے کھڑے ہونے کی طاقت نہیں ہے، ورنہ کھڑے ہوکر تعظیم بجالاتا...... اے خوشا نصیب کہ جلووں میں نہلا دیا گیا...... **الصلوٰۃ والسلام علیک یاسیدی یارسول اللہ۔**"

راوی کا بیان ہے کہ جمعہ کی رات اسی عالم کیف ونور میں گزری۔ صبح کے وقت طبیعت نہایت ہشاش بشاش تھی۔ ۱۲ بجے دن کے وقت میں نے دودھ کا ایک گلاس پیش

کیا۔ پہلے تو حضرت نے انکار فرمایا لیکن جب میں نے شہد لا کر اہل مدینہ کا یہ محاورہ عرض کیا........ **صلوا علی الحبیب واشربو الحلیب** یعنی حبیب پر درود بھیجئے اور دودھ نوش فرمایئے، تو اس جملے پر دیر تک ہونٹ جنبش کرتے رہے۔ اس کے بعد تھوڑا سا دودھ نوش فرمایا۔ اس کے چند ہی منٹ کے بعد دستگیر انس و جاں سرکار غوث جیلانی رضی اللہ عنہ کے حلقۂ جیلانیہ کے خطیب صاحب الفضیلۃ حضرت شیخ صبیح دامت برکاتہم القدسیہ تشریف لائے اور آپ سے ملاقات کی۔

یہ آخری شخص تھے، جن سے حضرت شیخ نے ملاقات فرمائی۔ اس کے بعد وہ کسی سے نہیں ملے۔ بارگاہ غوثیت سے حضرت شیخ کو جو عظیم نسبت حاصل تھی، یہ اسی کی برکت تھی کہ عین دم واپسیں کے وقت حلقۂ قادریہ کے ایک شیخ کامل نے انہیں رخصت کیا۔

ابھی وہ جلوہ فرما ہی تھے کہ چند منٹ کے بعد حضرت شیخ نے داعی اجل کو لبیک کہا ......لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی ایک دھیمی آواز کان میں آئی اور ہمیشہ کے لیے وہ زبان خاموش ہوگئی جس کے الفاظ چمن چمن میں بکھرے ہوئے ہیں۔

حضرت شیخ کے وصال کی خبر سارے مدینہ میں بجلی کی لہر کی طرح دوڑ گئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد علماء و مشائخ اور سادات کرام سے سارا گھر بھر گیا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے والوں کے ہجوم سے گلی میں تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔

عصر کے وقت حضرت کو غسل دیا گیا۔ غسل دینے والوں میں حضرت شیخ کے جانشیں و جگر گوشہ مظہر ضیاء حضرت مولانا الحاج فضل الرحمٰن صدیقی، نبیرۂ اعلیٰ حضرت حضرت مولانا ریحان رضا خاں عرف رحمانی میاں، حضرت مولانا قاری مصلح الدین صدیقی، حضرت مولانا مفتی نور اللہ صاحب محدث بصیر پوری، یونان میں حضرت شیخ کے خلیفۂ راشد مولانا اشرف القادری اور حضرت کے خادم خاص مولانا ابو القاسم ضیائی کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

غسل دیتے وقت حضرت کے جسم کے اس حصہ سے جہاں بحالت مرض انجکشن دیا گیا تھا، جلد کھل جانے کی وجہ سے تازہ خون بہنے لگا، جسے بڑی مشکل سے بند کیا گیا۔ حضرت کی یہ زندہ کرامت دیکھ کر لوگ ششدر رہ گئے اور دلوں میں یہ اعتقاد راسخ ہو گیا کہ اللہ والے مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔

غسل کے بعد حلقۂ قادریہ مدینہ طیبہ شاخ کے احباب اور حضرت شیخ کے متوسلین واقارب نے حضرت کو کفن پہنایا...... سر مبارک کے نیچے روضۂ پاک کے حجرہ شریف کی خاک اور روضۂ پاک کا غلاف رکھا گیا........ کفن پر گنبد خضریٰ کا غسالہ اور عطر چھڑکا گیا...... اور خوشبودار پھول ڈالے گئے۔

بعد نماز عصر مسجد نبوی شریف کے ریاض جنت میں شام کے تاج المشائخ عارف باللہ حضرت شیخ محمد علی مراد کی اقتداء میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ نماز جنازہ میں انڈونیشیا، الجزائر، ترکی، مصر، شام، حجاز مقدس، جزائر عرب، ہند و پاک اور عرب وعجم کے بہت سارے بلاد وامصار کے علماء، مشائخ اور عام مسلمانوں نے شرکت کی۔

نماز جنازہ کے بعد ہزاروں مجمع عشاق کے ساتھ جنازۂ مبارکہ کا جلوس تہلیل وتکبیر کے ساتھ مدینہ کے قبرستان ''جنۃ البقیع'' کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں اہل بیت اطہار کے مزارات طیبات کے پہلو میں حضرت کی لحد پہلے سے تیار تھی۔

حضرت شیخ کو ان کے جگر گوشہ اور جانشین حضرت مولانا فضل الرحمٰن صدیقی نے خلفاء، اعزہ اور ممتاز علماء ومشائخ کے تعاون سے لحد میں اتارا۔

عینی شاہد کا بیان ہے کہ لحد میں جب حضرت شیخ کے چہرے سے کفن ہٹایا گیا تو دیکھنے والوں پر ایک حیرت کا عالم طاری ہو گیا۔ اتنا حسین، پرنور اور شگفتہ چہرہ زندگی میں انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، بیساختہ لوگوں کی زبانوں سے تسبیح وتہلیل کی آواز بلند ہو گئی۔ بلاشبہ

چہرے پر انوار کی مچلتی ہوئی تجلی ایک پیکر عشق ووفا کی سچائی، حق پرستی اور محبوبیت کی کھلی ہوئی دلیل تھی۔

ٹھیک اس وقت جب کہ مدینہ کے افق پر آفتاب کی زرد ٹکیہ ڈوب رہی تھی، دنیائے اسلام وسنیت کا مہر تاباں لحد کے آغوش میں غروب ہو گیا۔

مسند گل منزل شبنم ہوئی   دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

٪=٪=٪

جلالۃ العلم

حافظ ملت

شیخ عبد العزیز محدث مرادآبادی

جدھر پہنچا نئی دنیا بسالی
یہ دیوانہ تو دیوانہ نہیں ہے

ایک شخصیت ساز استاذ

اپنی فکر کی حیرانی کا عالم کیا بتاؤں...... جب بھی حافظ ملت پر کچھ لکھنے کے لیے قلم اٹھایا، ان کی ہمہ گیر زندگی کے بے شمار عنوانات نگاہوں کے سامنے بکھر گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ نور کی کثرت بھی کبھی نظر کے لیے حجاب بن جاتی ہے۔ بالکل اسی کیفیت کا میں بار بار شکار ہوا اور ہر بار عنوان کے انتخاب کا مرحلہ کسی اور موقع کے لیے ٹلتا رہا۔ ادھر شب و روز کے پیہم اسفار اور کثرت مشاغل کے باعث ذہن اتنا پراگندہ ہو گیا ہے کہ بکھرے ہوئے افکار کو سمیٹنے کے لیے جس فرصت اور سکون کی ضرورت ہے، وہ میسر نہیں...... پھر بھی ادارۂ اشرفیہ کے کارپرداز حضرات کے اصرار پر حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کی مبارک و مسعود زندگی کے صرف ایک رخ پر اپنے منتشر خیالات قلم کے سپرد کر رہا ہوں۔

حافظ ملت کی زندگی کا سب سے نمایاں جوہر اپنے تلامذہ کی پرسوز تربیت اور ان کی شخصیتوں کی تعمیر ہے۔ اپنے اس وصف خاص میں وہ اتنے منفرد ہیں کہ دور دور تک کوئی ان کا شریک وسہیم نظر نہیں آتا۔ شخصیت سازی کے فن میں کوئی مستقل کتاب اب تک میری نظر سے نہیں گزری، لیکن اپنی معلومات وتجربات کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس فن کے امام تھے۔ شخصیت سازی سے میری مراد اپنے تلامذۃ کو ان اوصاف کا حامل بنانا ہے جو ایک ''مردمؤمن'' کی زندگی کے لیے لازمی ہیں۔ درس وتدریس کی دنیا میں اس فن کے نام سے اگر کوئی فن پہلے سے موجود تھا تو بلاشبہ انہوں نے اس فن میں گرانقدر اضافے کیے ہیں بلکہ یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی صاحب فکر وقلم حافظ ملت کی زندگی کا گہرا مطالعہ کرے تو اسے شخصیت سازی کے فن پر اتنے مواد مل جائیں گے کہ وہ آسانی سے اس فن پر ایک ضخیم کتاب تیار کرسکتا ہے۔

تاج محل کی تعمیر آسان ہے، لیکن شخصیتوں کی تعمیر کا کام بہت مشکل ہے۔ حافظ ملت کو اس کام سے عشق کی حد تک تعلق تھا۔ سفر میں، حضر میں، حلقۂ درس میں، مجلس خاص میں، جلسۂ عام میں...... کہیں بھی وہ ایک لمحے کے لیے اپنے فریضۂ عشق سے غافل نہیں رہتے تھے۔ تاریخ میں مصلحین واساتذہ کی زندگیوں کے جو بے شمار واقعات محفوظ ہیں، ان میں شخصیت سازی سے متعلق بکھرے ہوئے جزئیات کا اگر آپ گہرا مطالعہ کریں تو آپ میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ شخصیت سازی کے لیے کسی معلم ومصلح میں ان پانچ اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔شفقت ۲۔ذہانت ۳۔تدبر ۴۔علم ۵۔تقوی

اور حقائق وواقعات شاہد ہیں کہ یہ پانچوں اوصاف حافظ ملت کی زندگی میں ابھرے ہوئے نقوش کی طرح نمایاں تھے۔

جہاں تک شفقت کا تعلق ہے، وہ اپنے تلامذہ پر باپ سے بھی زیادہ شفیق تھے۔

باپ کی محبت بھی اپنے بیٹوں کے درمیان کبھی کبھی غیر متوازن ہو جاتی ہے یہاں تک کہ باپ کے خلاف بعض اولاد کو امتیازی سلوک کا شکوہ ہونے لگتا ہے۔ لیکن اپنے ہزاروں تلامذہ کے ساتھ حافظ ملت کا مشفقانہ سلوک اتنا عجیب وغریب تھا کہ ہر شخص اس خیال میں مگن رہتا تھا کہ حضرت مجھ ہی کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ محبت کی متوازن تقسیم یوں بھی ہوسکتی تھی کہ ہر شخص یہ محسوس کرتا کہ حضرت سب کو مساوی طور پر چاہتے ہیں، لیکن ہر شخص کی یہ خوش عقیدگی کہ حضرت مجھ ہی کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں، بلاشبہ شفقت ہی کا نہیں بلکہ ذہانت وتدبر کا بھی کمال ہے.........اور حیرت دوچند ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تلامذہ کی یہ خوش عقیدگی عارضی نہیں تھی جسے کسی وقتی التفات کا نتیجہ قرار دیا جائے اور پھر نئے تجربات کے بعد ان کا احساس بدل جائے، بلکہ یہ خیال ایک بار جس کے دل میں جا گزیں ہو گیا رگ جاں کی طرح زندگی بھر کا رفیق ہو گیا۔

اور یہ بھی نقش ہی کی پختگی کہی جائے گی کہ سیرت وکردار کی تربیت اور تحصیل علم وکمال کے ذیل میں ہر شخص کو ایسے مواقع بار بار پیش آئے جب کہ حافظ ملت کے زجر وتوبیخ اور خفگی وتعزیر کا انہیں نشانہ بننا پڑا، لیکن اس کے باوجود احساس کا وہ آبگینہ جو ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتا ہے، زمین پر پٹک دیئے جانے کے بعد زخمی تک نہیں ہوا اور عطاؤں پر مگن رہنے والے خطاؤں پر سزاؤں کو بھی شفقت ومحبت ہی کا حاصل سمجھتے رہے۔

اور پھر اپنے شاگردوں پر حافظ ملت کی شفقت کسی خارجی محرک کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ایسا لگتا ہے کہ ان کی پاکیزہ سرشت ہی شفقت ومحبت کے خمیر سے تیار ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر استاذ صرف اپنے ذہین ومحنتی اور وفا شناس شاگردوں پر شفیق ہوتا ہے، لیکن حافظ ملت کی خصوصیت یہ ہے کہ غبی سے غبی، بدھو سے بدھو اور بیگانہ سے بیگانہ شاگرد بھی انہیں اتنا ہی عزیز تھا جتنا ذہین سے ذہین، قابل سے قابل اور قریب سے قریب شاگرد۔

اور وہ مقام جہاں ہم حافظ ملت کو ایک منفرد شفیق استاد کے پیکر میں دیکھتے ہیں، یہ

ہے کہ دنیا میں کوئی شخص بھی اپنے باغی، نافرمان اور بدخواہ کے حق میں اپنی محبت وشفقت کے توازن کو برقرار نہیں رکھ سکتا، لیکن حافظ ملت کی کتاب زندگی کا آپ مطالعہ کریں تو ورق ورق پر جہاں آپ انہیں نیاز مندوں اور وفا شناسوں کو خلعت کریمانہ سے شاد کام کرتے ہوئے دیکھیں گے وہیں وہ نافرمانوں اور ناعاقبت اندیشوں پر بھی پھول برساتے ہوئے آپ کو نظر آئیں گے۔

اور اسے بھی ہم جذبۂ شفقت ومحبت ہی کا داعیہ کہیں گے کہ بڑے سے بڑے قصور پر مدرسہ سے طلبہ کا اخراج حضرت کی طبیعت پر بہت ہی شاق گزرتا تھا۔ فرماتے تھے کہ مدرسہ سے طلبہ کا اخراج بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی باپ اپنے کسی بیٹے کو عاق کردے یا جسم کے کسی بیمار عضو کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔ انتظامی مصالح کے پیش نظر اگرچہ یہ شرعاً مباح ہے، لیکن اسے بھی ''ابغض المباحات'' کے قبیل سے سمجھتا ہوں۔

ایک بار ارشاد فرمایا: نیکوکار، صلاح پذیر اور اچھے طلبہ کو چاہنا استاد کا کمال نہیں بلکہ شاگرد کا کمال ہے کہ اس نے اپنے آپ کو چاہنے کے قابل بنالیا۔ استاد کا کمال تو یہ ہے کہ جو چاہے جانے کے قابل نہ ہو اس کی اصلاح کر کے اسے چاہے جانے کے قابل بنادے۔

ایک دن مجلس درس میں ارشاد فرمایا کہ استاد اپنے شاگردوں کے فکر وذہن کا معمار اور ان کی سیرت وکردار کا معالج ہوتا ہے اور ایک معالج کی بہترین جگہ بیماروں کا حلقہ ہے، تندرستوں کی انجمن نہیں ہے۔ جو معالج بیماروں کا قرب برداشت نہ کر سکے اسے کچھ اور تو کہا جائے گا، لیکن معالج نہیں کہا جائے گا۔

استاد شاگرد کا تعلق عام طور پر حلقۂ درس تک محدود ہوتا ہے، لیکن اپنے تلامذہ کے ساتھ حافظ ملت کے تعلقات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ پوری درس گاہ اس کے ایک گوشے میں سما جائے۔

یہ انہیں کے قلب ونظر کی ناپیدا کنار وسعت اور انہیں کے جگر کا بے پایاں حوصلہ تھا کہ اپنے حلقۂ درس میں داخل ہونے والے طالب علم کی بے شمار ذمہ داریاں وہ اپنے سر لے لیتے تھے.........طالب علم درسگاہ میں بیٹھے تو کتاب پڑھائیں........ باہر رہے تو اخلاق وکردار کی نگرانی کریں.........مجلس خاص میں شریک ہو تو ایک عالم دین کے محاسن واوصاف سے روشناس فرمائیں......... بیمار پڑ جائے تو نقوش وتعویذات سے اس کا علاج کریں.......تنگدستی کا شکار ہوجائے تو مالی کفالت فرمائیں....... پڑھ کر فارغ ہوجائے تو ملازمت دلوائیں.........اور ملازمت کے دوران کوئی مشکل پیش آئے تو اس کی بھی عقدہ کشائی فرمائیں.........طالب علم کی نجی زندگی، شادی بیاہ، دکھ سکھ سے لے کر خاندان تک کے مسائل میں دخیل وکارفرما.......طالب علم زیر درس رہے یا فارغ ہوکر باہر چلا جائے، ایک شفیق باپ کی طرح ہر حال میں سرپرست اور کفیل............اس طرح کی ہمہ گیر اور ہمہ وقتی شفقت ایک باپ سے تو ضرور متوقع ہے لیکن آج کی دنیا میں ایک استاد سے ہرگز متوقع نہیں۔ یہی وہ جوہر منفرد ہے جس نے حافظ ملت کو اپنے اقران ومعاصرین کے درمیان ایک معمار زندگی کی حیثیت سے ممتاز اور نمایاں کردیا ہے۔

اور یہ لطیف نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ دل کے کسی ایوان میں شفقت ومحبت تنہا سکونت پذیر نہیں ہوتی، بلکہ اپنے بے شمار اعوان وانصار کے جھرمٹ میں رہتی ہے۔ تحمل، ایثار، اخلاص، بلند ہمتی، حلم ودرگزر، استقامت واستقلال، ہمدردی وغمگساری، احسان وکرم، سخاوت وفیاضی، بے غرضی واستغناء، مشقت ودرسوزی، خیرخواہی وخوش اندیشی اور صبر وضبط..........یہ کل کے کل شفقت ومحبت ہی کی انجمن کے حاشیہ نشیں اور ارکان مجلس ہیں۔اس لیے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ حافظ ملت اپنے دور کے بے مثال شفیق استاد تھے تو اسی کے ذیل میں ہم اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ان محاسن میں بھی وہ اپنے عہد کے ایک منفرد معلم تھے.........ایک منفرد مربی تھے.........اور اسی کے ساتھ ایک منفرد مرشد

ومزکی بھی تھے۔

اور بلا شبہ یہ سارا کمال حافظ ملت کے استاد حضرت صدرالشریعہ علیہ الرحمۃ والرضوان کا ہے کہ ایسا نادرالوجود اور عبقری شاگرد انہوں نے پیدا کیا۔

جب تک آسمان پر ستاروں کی قندیلیں روشن ہیں، خدائے حی وقیوم استاد اور شاگرد دونوں کی تربتوں پر رحمت وانوار کے بادل برسائے۔

بہت عجلت میں سفر کے دوران اس مضمون کی ترتیب عمل میں آئی ہے۔ شخصیت سازی کے باقی اوصاف پر اشرفیہ کے شماروں میں یہ ناتمام مضمون مکمل کروں گا۔

☆☆☆☆

حافظ ملت کے
عشق مبین کی فتح

لو تبسم بھی شریک ناز ہوا
آج کچھ اور بڑھادی گئی قیمت اپنی

کل تک لوگ اس عقیدے کا مذاق اڑاتے تھے کہ کونین کا دارالسلطنت گنبد خضرا کی چھاؤں میں ہے لیکن اب جب کہ دلوں کا یہ عقیدہ پیکر محسوس بن کر سامنے آ گیا ہے تو کس کی شامت آئی ہے کہ آنکھوں کا مشاہدہ جھٹلائے۔ ویسے جھٹلانے کے لیے تو آنکھوں میں دھول جھونک کر بھی جھٹلایا جاسکتا ہے، لیکن اپنی ہی نظر کو جھٹلانا آسان نہیں ہے۔

اس داستان حیرت فزا کی تفصیل یہ ہے کہ سرگروہ اتقیا، امیر لشکر عاشقاں حضرت

استاذ العلماء شیخ الحدیث اشرفیہ مبارک پور ایک عرصۂ دراز سے دیار حبیب کی زیارت کے لیے بے تاب تھے، لیکن ساتھ ہی دل کا یہ بھی اصرار تھا کہ پروانۂ راہداری بغیر فوٹو کے حاصل ہو جائے۔

نیاز مندوں نے ہزار التجا کی کہ بین الاقوامی قانون سے کسی فرد خاص کا استثناء ناممکن کی حد تک دشوار ہے۔ اول تو سلف ہی سے چلا آ رہا ہے کہ اہل سنت کے اکابر کا دنیا میں کسی بھی حکومت سے کوئی نیاز مندانہ رشتہ نہیں ہے۔ بالفرض حکومت ہند نے بغیر فوٹو کے جانے کی اجازت بھی دے دی تو سعودی عرب پر ہم کیوں کر اثر انداز ہو سکیں گے، جب کہ وہاں کی حکومت عقیدۃً ہمیں اپنا حریف بھی سمجھتی ہے۔ لیکن دل دیوانہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ بہر حال کچھ دنوں کے بعد اس مرحلے کی سلسلہ جنبانی کے لیے ایک انجانے یقین کی روشنی میں قدم عالم اسباب کی طرف اٹھے۔

حسان الہند حضرت بیکل اتساہی جن کی دل آویز و سحر طراز شخصیت کا اثر فقیر کی کٹیا سے لے کر صدر مملکت کے ایوان تک یکساں طور پر ہر جگہ چھایا ہوا ہے، انہوں نے اس خدمت کا بیڑا اٹھا لیا۔

کوششوں کا سلسلہ آنجہانی پنڈت نہرو سے شروع ہو کر شری لال بہادر شاستری تک پہنچا، یہاں تک کہ شریمتی اندرا گاندھی کے عہد وزارت میں ہندوستان کے محکمۂ خارجہ نے اس سوال پر سعودی عرب سے رابطہ قائم کیا۔ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے درخواست کی فائل سعودی گورنمنٹ کے سربراہ سلطان امیر فیصل کے سامنے پیش کی گئی۔ انہوں نے اپنے خصوصی دستخط سے جواب ارسال کیا کہ ہماری حکومت شیخ الحدیث کو بغیر فوٹو کے حج و زیارت کے لیے حجاز میں داخل ہونے کی اجازت دیتی ہے۔ یہ اجازت نامہ بالکل پہلا اور آخری ہے۔

سعودی عرب کا جواب موصول ہونے کے بعد حکومت ہند نے بھی اجازت

دے دی اور مغل لائن سے سیٹ ریزرو کروالیا گیا۔ کاروائی کے آخری مرحلے میں پہنچتے ہی سارے ملک میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی۔

مغل لائن کی دی ہوئی تاریخ پر جب حضرت استاذ العلماء تیار ہوکر ممبئ پہنچے تو اچانک یہ خبر معلوم ہوئی کہ سعودی حکومت کا قونصل مقیم ممبئ بغیر فوٹو کے ویزا دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

دلوں پر بجلی گر پڑی.......... ارمانوں کا خون ہو کے رہ گیا......... داستان کا یہی وہ حصہ ہے جسے ہم ''عشق کی فتح مبین'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

گہرائی میں اترنے کے بعد معلوم ہوا کہ دیوبندی حلقوں کے تمام ذی اثر حضرات نے متحدہ طور پر سعودی حکومت کے قونصل سے درخواست کی ہے کہ سعودی گورنمنٹ کے ساتھ ہماری جماعت کی دیرینہ نیازمندیوں کا حال آپ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ لیکن اس غیر معمولی تعلق کے باوجود ہماری جماعت کے بعض اکابر کو انتہائی جدو جہد کے بعد بھی سفر حج کے لیے فوٹو سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ اب یہ اعزاز ایک ''بدعتی مولوی'' کو دیا جارہا ہے، جو نجدی عقائد کا سب سے بڑا حریف ہے۔ اگر یہ اعزاز واپس نہ لیا گیا تو ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

قونصل پر دیوبندی ریشہ دوانیوں کا اتنا گہرا اثر پڑا تھا کہ اس نے اپنے طور پر ویزا نہ دینے کا حتمی فیصلہ کرلیا تھا۔ کئی دنوں تک لطائف الحیل سے ٹالتا رہا، یہاں تک کہ وہ تاریخ آگئی جس دن جہاز کھلنے والا ہے۔ اب فاصلے کا شمار گھنٹوں میں رہ گیا، لیکن اب تک ویزا نہیں ملا ہے۔

یہی وہ نازک گھڑی تھی جب کہ اہل ممبئ نے کھلی آنکھوں سے ایک سچے نائب رسول کی روحانی برتری کا تماشا دیکھا۔ جب دو گھنٹے باقی رہ گئے تو بعض سادہ لوح نیازمندوں نے مشورہ دیا کہ اب فوٹو کھنچوائے بغیر کام بنتا نظر نہیں آتا۔

یہ سن کر فرط جلال سے حضرت کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ کچی نیند سے جاگنے والے محشر اضطراب کو دوبارہ سلا دینا ممکن نہیں تھا۔ اب مادی تدبیروں کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ دلگداز بے چینیوں کے عالم میں حضرت نے اپنا کمرہ خالی کروا کر اندر سے دروازہ بند کرلیا۔

پلک جھپکتے ہی آہوں کا قافلہ مدینہ پہنچ گیا.........اب دل دیوانہ فرماں روائے کونین کی چوکھٹ پر تھا.........عاشق پرسوز نے کیا فریاد کیا.........سرکار نے برستی ہوئی آنکھوں پر کس طرح رحمت کی آستین رکھی ....یہ سارا ماجرا صیغۂ راز میں ہے ....باہر کھڑے رہنے والے ہجوم کو صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ جب کمرے کا دروازہ کھلا تو حضرت بیکل اتساہی ویزا لیے کھڑے تھے۔

وفور جذبات میں وہ صرف اتنا کہہ سکے کہ نئی دہلی سے سعودی سفیر کا ٹیلیفون آیا کہ شیخ الحدیث کو فوراً ویزا دیا جائے.........اور بے تحاشا قدموں پر گر پڑے۔

حضرت نے انہیں اٹھا کر سینے سے لگایا۔ دوست تو دوست دشمنوں نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کرلیا کہ جن خاک نشینوں کے طرفدار گنبد خضرا کے تاجدار ہیں ان پر فتح پانا مشکل ہے۔

نگاہ یاس مری کام کر گئی آخر
رلا کے اٹھے تھے وہ مسکرا کے بیٹھ گئے

××××

حافظ ملت اور تحریک اشرفیہ

مبارکپور میں حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کے ابتدائی ایام نہایت صبر آزما اور حوصلہ شکن تھے کہ رستم وسہراب بھی ہوتے تو ان کے پاؤں اکھڑ جاتے۔ ان ایام میں تن تنہا حضرت حافظ ملت علیہ الرحمہ کو ایک ایسی جنگ لڑنی پڑی جسے فتح کرنے کے لیے مختلف صلاحیتوں کے ساتھ بے شمار افراد کی ضرورت تھی۔

اس دور کے چشم دید راویوں کی بہت بڑی تعداد دنیا سے رخصت ہوگئی۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کے بچے کھچے لوگوں میں یہ خاکسار بھی شامل ہے، جسے اس دور میں حافظ ملت کی ہم رکابی کا شرف حاصل تھا۔ پرانا مدرسہ جو آج مبارکپور کی پرانی بستی میں موجود ہے۔ یہ حافظ ملت کی درسگاہ تھی، جہاں بیٹھ کر انہوں نے اہل سنت کے ایک عظیم مستقبل کا نقشہ تیار

کیا تھا۔آج روئے زمین کے دور دراز خطوں میں اہل سنت کے جو ہزاروں مراکز سرگرم عمل ہیں، یہ اسی نقشے کے خطوط ہیں۔

حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ والرضوان کے حکم پر حافظ ملت علیہ الرحمہ تن تنہا مبارکپور تشریف لائے۔اس وقت انہیں چند محنتی طلبہ کی ضرورت تھی، چنانچہ میرے برادر اکبر حضرت علامہ آسی پیا حسنی مدظلہ العالی نے مجھے حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے گہوارۂ علم وادب میں پہنچا دیا۔ جیسے ہی تعلیمی سلسلہ شروع ہوا اور مبارکپور میں اہل سنت کی ایک معیاری درسگاہ کے قیام کا غلغلہ قرب وجوار میں بلند ہوا، مذہبی حریفوں میں ایک کھلبلی مچ گئی اور تخریبی کاروائیوں کے لیے پورے ضلع سے ان کی بکھری ہوئی قوتیں مبارکپور میں سمٹ آئیں۔وہ اپنے زعم باطل میں یہ سمجھے ہوئے تھے کہ تن تنہا اور نو وارد مسافر کو کہ جس کے ہمنوا اور حامی بھی انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، مبارکپور سے باہر نکالنا کون سا مشکل کام ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی شرارتوں کا آغاز کرتے ہوئے ایک جلسہ کا انعقاد کیا اور مذہب اہل سنت کی مخالفت میں اشتعال انگیز تقریریں کیں۔مبارکپور کی اکثریت ان کے ساتھ تھی، اس لیے ان کی تقریروں کا خاطر خواہ اثر پڑا۔لیکن دوسرے دن جب جوابی جلسہ ہوا اور حافظ ملت کی معرکۃ الآراء تقریر ہوئی تو جلسہ کے بعد ایسا محسوس ہورہا تھا کہ مبارکپور کے لوگ اندھیرے سے اجالے میں آگئے۔حزب مخالف کو لینے کے دینے پڑ گئے۔پہلے تو وہ وہاں کے عوام کو اپنے دیرینہ تعلقات کی بنیاد پر حافظ ملت علیہ الرحمہ سے توڑ دینا چاہتے تھے، لیکن اب خود ان کی عوام ٹوٹتی ہوئی نظر آنے لگی۔اس لیے اپنی عوام کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے پھر انہیں جلسہ کرنا پڑا۔اسی طرح چھ مہینے تک دونوں طرف جلسوں کے انعقاد کا سلسلہ جاری رہا اور تقریروں کے تبادلے ہوتے رہے۔حافظ ملت اور ان کے تلامذہ کی تقریروں کا مبارکپور کی عوام پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ مبارکپور کی مسلم آبادی کا تین چوتھائی حصہ ٹوٹ کر حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کے ساتھ ہوگیا۔

چھ مہینے کا یہ زمانہ حافظ ملت کے لیے انتہائی مصروفیات کا زمانہ تھا۔ صبح سے شام تک تنہا اٹھارہ کتابوں کا درس، افتاء کا کام، عوام کی دینی، روحانی اور معاشرتی ضروریات کی تکمیل اور شب میں تقریروں کا سلسلہ...... ایک لمحے کے لیے بھی سکون واطمینان کا وقفہ دستیاب نہیں تھا۔ عصر سے مغرب تک جو تفریح کا وقت تھا، وہ جوابی تقریروں کی تیاری کے لیے مخصوص تھا۔ ہم چند محنتی طلبہ تفریح میں حضرت کے ساتھ ہو جاتے اور راستہ چلتے ہوئے حضرت کو شب گذشتہ ہونے والے حزب مخالف کے جلسہ کی رپورٹ سناتے تھے۔ حضرت اسی وقت برجستہ ان کے اعتراضات کے جوابات مرحمت فرماتے اور تقریر کرنے والے ساتھیوں کے درمیان اس دن کے جلسہ کے لیے الگ الگ موضوع بھی تقسیم فرما دیتے۔

اس چھ مہینے کی مدت میں حضرت حافظ ملت کے علمی تبحر اور فکری بصیرت کی گہرائی واستقلال کا قوم نے جتنا سخت امتحان لیا، اس دور میں اس کی مثال مشکل ہی سے مل سکے گی۔ آج مبارک پور کے مسلمانوں کی یہ خصوصیت عالمگیر شہرت حاصل کر چکی ہے کہ دین کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے میں وہ منفرد کردار کے مالک ہیں، لیکن تصویر کا یہ رخ اب تک مؤرخین کی نگاہوں سے اوجھل ہے کہ گوشت اور پوست کے ڈھانچے میں جذبات کا یہ تلاطم کس کی نظر کیمیاء اثر نے برپا کیا ہے؟......... دنیا سے انصاف کا چراغ اگر گل نہیں ہوا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ علم وحکمت کے عروج وارتقا میں جو کارواں حافظ ملت علیہ الرحمہ کی سربراہی میں پرانے مدرسے کے کھنڈر سے روانہ ہو کر اشرفی روڈ کی دو منزلہ عمارت تک پہنچا اور پینتیس سالوں کے بعد اپنے بالواسطہ اور بلاواسطہ ہزاروں فرزندوں کو اپنے جلو میں لیے ہوئے آج عربی یونیورسٹی کی شکل میں مبارک پور کے باہر ایک کھلے ہوئے میدان میں فرد کش ہے، یہ طویل کہانی تنہا حافظ ملت کی ایک ذات کے گرد گھوم رہی ہے۔

ایک بے آب وگیاہ ویرانہ تا حد نظر علوم ومعارف کے شاداب گلشن میں یوں ہی نہیں تبدیل ہو گیا........ مسکراتے ہوئے لالہ زاروں........ اور مہکتے ہوئے غنچوں کے

پیچھے جہاں حافظ ملت کے پسینے کی خوشبو اور ان کے خون جگر کی سرخی کارفرما ہے ....
وہاں ان کے بے مثال ایثار و اخلاص.............نا قابل تسخیر عزم و استقلال.........قلوب کو
پگھلا دینے والا زہد وتقوی ....اور سفر وحضر میں ....خلوت وجلوت میں
........اندھیرے میں ....اجالے میں ....دیس پردیس میں ....صحرا میں
........آبادی میں ....ملکوتیوں کی طرح ان کے کردار کا تقدس مبارکپور کی عظیم تاریخ کا
نقطۂ آغاز بھی اور حرف اخیر بھی ہے۔

مولائے غافر وقدیر کی بے پایاں رحمتیں اس شہید وفا کی تربت پر ہمیشہ برستی
رہی..........جس کی برستی ہوئی آنکھوں کا آبشار آج بھی دعوت نظارہ دے رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

حافظ ملت
اور احیاء دین کی عظیم تحریک

رئیس یاد ہیں لاکھوں حکایتیں لیکن
کوئی سنے تو سناؤں کوئی کہے تو کہوں

حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ ورضوان اپنے ذاتی فضائل وکمالات، اپنے جذبۂ ایثار واخلاص، اپنے زہد وتقویٰ، اپنے علمی تجربہ، اپنی علمی حکمت وفراست، اپنے مقام تقرب وعرفان، اپنے اخلاقی محاسن ومکارم کے اعتبار سے جس مقام بلند پر فائز تھے، اس کا اعتراف دوست تو دوست دشمن کو بھی ہے۔ لیکن جس خصوص میں انہوں نے اپنے عصر ہی نہیں بلکہ اپنے ماضی کے بھی ہزاروں علماء کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، وہ ہے انکی مردم سازی اور نسل انسانی کے احیاء کا مشن............اور وہ بھی اس شان کے ساتھ کہ اس کا تسلسل موت کا فرشتہ بھی نہیں توڑ سکا۔ علم وآگہی اور شخصیت سازی کا جو چشمۂ فیض ان کی حیات ظاہری

میں جاری تھا وہ آج بھی جامعہ کے احاطے میں ابل رہا ہے۔ حافظ ملت نے بے آب وگیاہ میدان میں جس چشمۂ فیض کی بنیاد رکھی، وہ محض حسن اتفاق کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ ان کی فکر رسا نے اچھی طرح اس حقیقت کا سراغ لگالیا تھا کہ کوئی قوم اپنے قائد کے بغیر نہ اپنا وجود باقی رکھ سکتی ہے اور نہ اپنے تشخص کا تحفظ کر سکتی ہے اور یہ نکتہ بھی ان کی نگاہ سے مخفی نہیں تھا کہ تعلیم کے بغیر قیادت کی صلاحیتوں کا ابھرنا ممکن نہیں ہے۔

اس لیے حقائق کی روشنی میں انہوں نے ایک ایسے آفاقی سطح کے دینی تعلیمی مرکز کے قیام کا فیصلہ کیا، جہاں سے علمائے اسلام کی بارآور نسل ہمیشہ پیدا ہوتی رہے۔

اس راہ کی مشکلات سے وہ پوری طرح باخبر تھے، لیکن آنے والی نسلوں کو دین حق کے ساتھ مربوط رکھنے کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی شکل بھی نہیں تھی۔ یہ حقیقت بھی ان کی نگاہ سے اوجھل نہیں تھی کہ کسی ہمہ گیر تعلیمی منصوبے کی تکمیل کے لیے بنیادی طور پر دو چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ بہترین اسٹاف اور ضرورت کے مطابق عمارتیں۔

جہاں تک اسٹاف کا سوال تھا، اسے اپنی تیس سالہ مدت تدریس میں انہوں نے خود ہی تیار کر لیا تھا۔ علم وفن کے مختلف اصناف میں خود ان کے پیدا کردہ ماہرین اتنی بڑی تعداد میں تھے کہ جہاں بھی وہ بیٹھا دیے جاتے ایک دینی یونیورسٹی کی بنیاد پڑ جاتی۔ اس لیے اب صرف سوال عمارتوں کی تیاری کا تھا۔ چنانچہ اس کے لیے انہوں نے مبارکپور کے باہر زمینوں کی خریداری کا سلسلہ شروع کیا۔ جب ۱/۳۳ ایکڑ زمین کا وسیع رقبہ حاصل ہو گیا تو اب کام کے آغاز کی انہیں فکر لاحق ہوئی۔

واضح رہے کہ اس وقت حافظ ملت دارالعلوم اشرفیہ کے صرف صدر مدرس تھے۔ انتظامی امور میں وہ اتنے بااختیار نہیں تھے کہ کوئی منصوبہ صرف اپنی صوابدید پر شروع کر سکیں۔ اس لیے انہیں اپنے منصوبے کے آغاز کے لیے مجلس انتظامیہ سے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت پڑی۔ مگر اس میں کامیابی ہوتی نظر نہ آئی۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ

مبارکپور کی سرزمین پر وہ اپنے فکری منصوبے کو عملی شکل نہیں دے سکتے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ ملک کے کسی بھی خطے میں اس کام کا آغاز کیا جائے گا۔

حافظ ملت کی عزیمت واستقامت کے سیل رواں کے سامنے مشکلات کی کوئی دیوار کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ جگہ کے انتخاب کے سلسلہ میں حضرت موصوف نے مولانا حافظ عبدالرؤف صاحب بلیاوی علیہ الرحمہ کی قیادت میں ایک سہ رکنی وفد کی تشکیل فرمائی، جس کے ارکان میں یہ راقم الحروف اور حضرت مولانا محمد شفیع صاحب اعظمی علیہ الرحمہ بھی شامل تھے۔ اتر پردیش کے چند مقامات کی نشاندہی فرماتے ہوئے حضرت نے وفد کو واضح طور پر ہدایت فرمائی کہ کس کس رخ سے ان سارے مقامات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

وفد کو جن مقامات کا سروے کرنا تھا، ان میں مغل سرائے، سلیم پور، گورکھپور اور بلرام پور شامل تھے۔ ایک ہفتے کے بعد جب یہ وفد واپس لوٹا اور ان کے سامنے جائزے کی رپورٹ پیش کی تو حضرت نے بلرامپور کو اپنے منصوبے کے آغاز کے لیے پسند فرمایا، کیونکہ وہاں کے چند باہمت اور حوصلہ مند افراد نے ابتدائی مرحلے میں سو بیگھے زمین کا رقبہ مجوزہ تعلیمی مرکز کے لیے وقف کرنے کی پیش کش کی تھی۔

جگہ کا مسئلہ طے ہو جانے کے بعد اب حضرت نہایت خوشی کے ساتھ بلرامپور منتقل ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ شدہ شدہ یہ بات مبارکپور کے چند سنی مسلمانوں کو معلوم ہوگئی اور جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر سارے قصبے میں پھیل گئی۔ یہاں تک کہ ایک دن قصبہ کے ذی اثر مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد اس خبر کی تصدیق کے لیے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب میں عمر کے آخری مرحلے سے گزر رہا ہوں۔ میری زندگی کی آخری خواہش ہے کہ جماعت اہل سنت کے مذہبی مستقبل کے تحفظ کے لیے جو منصوبہ میرے ذہن میں ہے، اسے اپنے سفر آخرت سے پہلے زمین پر منتقل کردوں۔ اس لیے اب میں نے اپنی اس علمی تحریک کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے

دوسری جگہ کا انتخاب کرلیا ہے۔ اور ایک دن کا وقت ضائع کیے بغیر میں وہاں منتقل ہو رہا ہوں۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ دارالعلوم اشرفیہ کا نہ کوئی اسٹاف میرے ساتھ جائے گا اور نہ کوئی طالب علم۔ اس لیے میرے یہاں سے ہٹ جانے کے بعد بھی یہ کارخانہ اسی طرح چلتا رہے گا، کیوں کہ اس چمنستان علم و مکتب کو بھی میں اسی طرح آباد اور پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہوں۔

حضرت کا یہ جواب سن کر لوگ واپس لوٹ گئے اور سارے قصبے و مضافات کے سنی مسلمانوں کی ایک بہت بڑی مجلس شوریٰ ان لوگوں نے بلوائی اور انہیں حضرت علیہ الرحمہ کے فیصلہ سے مطلع کیا۔

یہ سننا تھا کہ ہزاروں افراد پر مشتمل سارا مجمع چیخ اٹھا کہ حضرت کو کسی قیمت پر یہاں سے جانے نہیں دیا جائے گا۔ ہم ان کے دروازے پر اپنے بال بچوں کے ساتھ دھرنا دیں گے اور جب تک وہ اپنا ارادہ نہیں بدلیں گے ہم وہاں سے نہیں لوٹیں گے۔ اسی میٹنگ میں یہ بات بھی متفقہ طور پر طے پائی کہ حضرت طے کردہ اپنے تعلیمی منصوبے کا آغاز مبارکپور ہی کی سرزمین پر کریں اور کل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی کریں۔

اسی مجلس میں حاضرین کے مطالبے پر دارالعلوم کی انتظامیہ تحلیل کردی گئی اور دارالعلوم کے سربراہ اعلیٰ کی حیثیت سے ادارے کا سارا نظام ان کے ہاتھوں منتقل کردینے کی قرارداد متفقہ طور پر منظور کرلی گئی۔

جب مجلس شوریٰ کی یہ تجویز لے کر لوگ حافظ ملت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے اسے پسند نہیں کیا، لیکن جب رائے عامہ کا دباؤ زیادہ بڑھ گیا تو مجبوراً انہیں مبارکپور چھوڑنے کا ارادہ بدلنا پڑا اور اپنے منصوبے کو دوسری جگہ منتقل کرنے کا ارادہ منسوخ کرنا پڑا۔ حضرت کے اس فیصلے سے مبارکپور اور مضافات کے سنی مسلمانوں میں عید جیسی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے بعد ہی حضرت کا کاروانِ فکر و عمل پوری تیز رفتاری کے ساتھ

اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہو گیا۔

سب سے پہلے دار العلوم کی نئی مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کیا اور انہیں اپنے منصوبے کی تفصیلات سے باخبر کرتے ہوئے قصبے کے باہر وسیع خطۂ اراضی پر درسگاہ کی مرکزی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے ایک ''تعلیمی کانفرنس'' کے انعقاد کی بات مجلس کے سامنے رکھی، جسے سارے ارکان نے بہت جوش و خروش کے ساتھ منظور کیا۔ اسی مجلس میں کانفرنس کی تیاریوں کے لیے ایک مجلس استقبالیہ کی تشکیل بھی عمل میں آئی۔ اس کے بعد راقم الحروف کو جمشید پور سے بلوایا اور میرے ذمہ تین کام سپرد فرمائے۔

پہلا کام تھا منصوبے کے پھیلاؤ کو سامنے رکھتے ہوئے تعلیمی ضروریات کے مطابق عمارتوں کا خاکہ تیار کرنا اور مرکزی درسگاہ کی عمارت کے لیے نہایت پرشکوہ اور دیدہ زیب نقشہ جمشید پور میں کسی ماہر انجینئر سے تیار کرانا۔

دوسرا کام تھا عمارت کی سنگ بنیاد کے لیے مجوزہ ''تعلیمی کانفرنس'' کے انعقاد کو اپنی جملہ تفصیلات کے ساتھ آخری شکل دینا۔

تیسرا کام تھا تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے لیے اساتذہ اور منتظمین کے مشورہ سے مندوبین کی ایک جامع فہرست تیار کرانا۔

کئی دن کی محنت کے بعد جب فہرست تیار ہو گئی تو مندوبین کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی ذمہ داری حضرت نے دار العلوم کے نظماء کے سپرد فرمائی۔ دوسری طرف حضرت علامہ حافظ عبدالرؤف صاحب قبلہ علیہ الرحمۃ والرضوان کی سربراہی میں دار العلوم کے اساتذہ اور ماہرین تعلیمات پر مشتمل ایک دستور ساز مجلس کی تشکیل فرما کر دار العلوم کے لیے ایک جامع دستور کی تدوین کا کام بھی اس کے سپرد کر دیا۔

حضرت کی ہدایات کے مطابق سارے لوگ اپنے اپنے کام پر لگ گئے۔ میں نے بھی ٹاٹا سٹیل کمپنی کے ایک ماہر انجینئر [illegible]

شاندار نقشہ تیار کروایا، جسے حضرت نے بے حد پسند فرمایا۔ اس کے بعد ہم لوگ تعلیمی کانفرنس کی تیاریوں میں لگ گئے۔ پوسٹر، دعوت نامے، رضا کاروں کے بیج، مجلس استقبالیہ کے مختلف دفاتر کے ٹوکن اور سکریٹری رپورٹ........یہ سارے کاغذات ہم نے اپنے اہتمام میں کلکتہ کے مختلف پریسوں میں چھپوائے۔ اس کے بعد قصبہ کے باہر مجوزہ میدان میں کانفرنس کے لیے خیموں کا شہر بسانے کا کام شروع ہوا۔

سب سے پہلے ہم نے لق و دق میدان کو مختلف مقاصد کے لیے مندرجہ ذیل خطوں میں تقسیم کیا:

جلسہ گاہ کا خطہ، استقبالیہ، انتظامیہ، معلومات اور رضا کاروں کے دفاتر کا خطہ، ہوٹلوں اور دکانداروں کا خطہ، صوبہ وار مہمانوں کی قیام گاہوں کا خطہ، وضوخانہ، طہارت خانہ اور نماز گاہ کا خطہ، علماء، مشائخ اور خطباء کی قیام گاہ کا خطہ...... چونکہ وہ موسم گرمی کا تھا اس لیے پانی کی سبیلوں اور پندرہ ہنڈ پایپ نصب کرنے کے لیے ایک خطہ نامزد کیا گیا۔ اخبارات کے نمائندوں کے لیے پریس گیلری کا خطہ۔

اس کے بعد الگ الگ خطوں میں چھوٹے بڑے شامیانوں، قناتو ں اور چھولداریوں کے ذریعہ ایک شہر بسانے کا کام شروع ہوا۔ جیسے جیسے کانفرنس کی تاریخیں قریب آتی جارہی تھیں میدان کی رونق اور چہل پہل بڑھتی جارہی تھی۔ رات رات بھر مجلس استقبالیہ کے رضا کار وممبران اسٹیج نصب کرنے، جگہ جگہ دروازے بنانے، جھنڈوں اور جھنڈیوں کا چمن سجانے، اسٹیج کی آرائش اور جلسہ گاہ کی زیب وزینت اور نقش ونگار کے کام میں مصروف نظر آتے تھے۔

چونکہ اس وقت تک مبارکپور میں لوگ تقریبات کے موقع پر گیس بتی استعمال کرتے تھے، اس لیے جس دن پانچ طاقتور جنریٹروں کے ذریعہ اس میدان میں ہزاروں بلب اور کئی سوٹیوب لائٹیں روشن ہوئیں، مبارکپور کا یہ ویران خطہ سچ مچ ایک خوبصورت شہر

میں تبدیل ہو گیا۔ پھر تو پنڈالوں، خیموں، شامیانوں اور قناتوں کے اس عارضی شہر کو دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ آنے لگے۔ رات دن تماشائیوں کی بھیڑ لگی رہنے کی وجہ سے چائے پان اور شربت وغیرہ کی دکانیں بھی لگ گئیں۔ اب یہ ویرانہ قصبہ اور مضافات کے لیے بہترین تفریح گاہ بن گیا۔ شام کے وقت بھیڑ اتنی بڑھ جاتی کہ کانفرنس سے پہلے ہی کانفرنس کا سماں بن جاتا۔ یہ ساری تفصیلات صرف اس لیے قلم بند کر رہا ہوں تا کہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی اس تحریک کے ساتھ علاقے کے مسلمانوں کی والہانہ وابستگی کا کیا عالم تھا۔

کانفرنس کی تاریخ سے ایک دو دن قبل ہی سے مہمانوں کے ورود مسعود کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ملک کا کوئی ایسا خطہ نہیں تھا جہاں سے مشاہیر علما، نامور اساتذہ اور شعلہ نوا خطباء کے قافلے نہ اترتے ہوں اور نوجوان افاضل کی تو کوئی گنتی نہیں تھی۔ چوٹی کے اکابر میں سے جو اہم شخصیتیں اس تاریخی تقریب میں جلوہ افروز ہوئیں، ان میں تاجدار اہل سنت شہزادۂ اعلیٰ حضرت منبع خیر و برکت حضور مفتی اعظم ہند زیب سجادہ آستانہ عالیہ قادریہ رضویہ بریلی شریف، امیر کارواں سیادت وقیادت سید العلماء حضرت علامہ شاہ مفتی سید آل مصطفیٰ صدر کل ہند سنی جمیعۃ العلماء ممبئی، امین شریعت وطریقت سلطان المتکلمین علامہ شاہ مفتی رفاقت حسین صاحب، پیکر فکر وغنا تارک ماسوا مجاہد ملت حضرت علامہ شاہ محمد حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ، امام علم وفن شمس العلماء حضرت قاضی شمس الدین صاحب قبلہ علیہم الرحمۃ والرضوان کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آج ۲۱ ربیع الاول ۱۳۹۲ھ بمطابق ۱۶ مئی ۱۹۷۲ء کی نورانی تاریخ تھی۔ آج کا دن اہل سنت کی تمام دینی اور علمی تاریخ کا سب سے بڑا دن تھا۔ آج ہی بعد نماز عصر تاجدار اہل سنت حضور مفتی اعظم ہند کے مبارک ہاتھوں سے علم ودانش کے ایک مردم خیز شہر کا سنگ بنیاد رکھا جانے والا تھا۔ مفتی اعظم اور دوسرے اکابر کی قیام گاہ دار العلوم اشرفیہ کی

جدید عمارت میں تھی۔ عصر سے فراغت کے بعد سنگ بنیاد کی رسم ادا کرنے کے لیے حضور مفتی اعظم ہند کا جلوس بہ ہزار جاہ وجلال جامعہ اشرفیہ کی عمارت سے خیموں کے نئے خطوں کی طرف روانہ ہوا۔ راستے بھر امنڈتے ہوئے دریا کی طرح پروانوں کا جلوس شامل ہوتا رہا یہاں تک کہ منزل تک پہنچتے پہنچتے ہر طرف آدمیوں کا سیلاب ہی سیلاب تھا۔ باب مدینۃ العلم پر پہنچ کر جلوس رک گیا۔ حضور مفتی اعظم سواری سے نیچے اترے اور حضور سید العلماء، حافظ ملت، امین شریعت، مجاہد ملت اور شمس العلماء کے جلو میں اس مقام کی طرف بڑھے، جہاں مرکزی درسگاہ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنا تھا۔ اکابر کا یہ پورا دستہ رضا کاروں کے حصار میں لکڑی کے زینوں کے ذریعہ بنیاد کی زمین پر اترا۔ فاتحہ کے بعد سب سے پہلی اینٹ حضور مفتی اعظم ہند نے رکھی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے سارے اکابر نے اینٹیں رکھیں۔

وہ وقت بڑا ہی رقت انگیز تھا جب بنیاد کے بعد حضور مفتی اعظم ہند نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے.........اس وقت سارے مجمع پر ایک عجیب بے خودی کی کیفیت طاری تھی.........خود مفتی اعظم کس حالت میں تھے اور وہ دعا کرتے ہوئے کہاں پہنچ گئے تھے یہ خدا ہی کو معلوم ہے، لیکن یہ ضرور دیکھا کہ آنکھیں اشک بار تھیں......ہونٹ شدت کیف سے لرز رہے تھے اور چہرہ پر عقدہ کشائی کی مسرتوں کے آثار نمایاں تھے۔

جب آمین پر دعا تمام ہوئی تو ایسا محسوس ہوا کہ الجامعۃ الاشرفیہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہے اور ہم کھلے آسمانوں کے نیچے نہیں بلکہ دیواروں کے سائے میں کھڑے ہیں۔ اس وقت حافظ ملت پر والہانہ کیفیت طاری تھی فرط مسرت سے ان کی آنکھ کے آنسو نہیں رک رہے تھے......اور کیوں نہ ہو کہ آج ان کی زندگی کا سب سے بڑا ارمان پورا ہو رہا تھا۔ سالہا سال تک اپنی روح کے گہوارے میں جس آرزوئے شوق کی انہوں نے پرورش کی تھی آج اس کی تکمیل کا دن تھا۔ آج حافظ ملت علیہ الرحمہ پھولے نہیں سما رہے تھے کہ اہل سنت کی نسلوں

کی دینی بہبود اور عزت ووقار کے لیے انہوں نے اس صدی کے سب سے بڑے کام کی بنیاد رکھ دی تھی۔

سید العلماء اور حضرت مجاہد ملت قریب ہی کھڑے تھے۔ ان حضرات کا گریۂ پرسوز بھی دیکھنے کے قابل تھا۔ حافظ ملت کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں آنسو کے قطرے دیکھ کر سید العلما سے رہا نہیں گیا۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں حافظ ملت کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا:

حافظ صاحب! تاریخ میں آپ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے........ہمارے اوپر سے آپ نے وہ قرض اتار دیا جس کے بوجھ سے گردنیں خم ہو گئی تھیں.........آپ پرچم اٹھائیے ....پوری قوم آپ کے پیچھے ہے........اور سن لیجئے کہ امید کی یہ دعا کبھی رائگاں نہیں جائے گی.........آپ کے دل کی دھڑکنوں کی آواز بحر و بر میں گونجے گی....... دشت وجبل میں گونجے گی........اور دنیا کے کونے کونے میں سنی جائے گی......خدائے قدیر آپ کی فلک پیما ہمتوں کی عمر دراز فرمائے۔

سید العلماء کی اس مختصر سی تقریر نے جذبات میں تلاطم برپا کر دیا تھا۔ بہت سے لوگوں پر تو ایسی رقت انگیز کیفیت طاری ہو گئی تھی کہ فرط اثر سے چیخ پڑے اور مجاہد ملت پر تو ایسی خموشی طاری تھی کہ جسے لوگ طوفان کا پیش خیمہ کہتے ہیں۔ جذبات کے تلاطم میں بڑی مشکل سے وہ اتنا کہہ سکے کہ حافظ ملت آپ نے مبارک پور میں آب حیات کا چشمہ جاری کر کے قوم کو مرنے سے بچالیا۔ مستقبل کی زندگی میں امین کی حیثیت سے آپ ہمارے درمیان ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

شام کو بعد نماز عشاء اجلاس عام شروع ہوا۔ لمبے چوڑے اسٹیج پر ملک کے طول و عرض سے آئے ہوئے علماء و مشائخ قطار در قطار بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ستاروں کی انجمن آج آسمان سے زمین پر منتقل ہو گئی ہے۔

تلاوت قرآن اور نعتیہ نغموں کے بعد مولانا قاری محمد یحییٰ صاحب جو اس وقت اشرفیہ کے ناظم تھے، مائک پر تشریف لائے اور سکریٹری رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ اپنی اس رپورٹ میں انہوں نے اشرفیہ کے ماضی اور حال کا بھرپور جائزہ لیا تھا، لیکن سارا مجمع یہ سننے کے لیے بیتاب تھا کہ خیموں کا شہر کس لیے بسایا گیا ہے اور ہزاروں علماء و مشائخ کی بھیڑ یہاں کیوں جمع ہوئی ہے؟ جب انہوں نے اپنی رپورٹ کے اس حصے کو پڑھنا شروع کیا جس میں حافظ ملت کے تعلیمی منصوبے کی تفصیل تھی، تو دو لاکھ کا مجمع تکبیر و رسالت اور حافظ ملت زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔

حافظ ملت کی مسیحائی نے مردہ رگوں میں زندگی کی ایسی روح دوڑا دی تھی کہ پتھروں کے جگر میں بھی طوفان شوق برپا تھا۔

رپورٹ ختم ہونے کے بعد مشاہیر علما اہل سنت کی تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔

اخیر میں حضور سید العلماء کھڑے ہوئے اور انہوں نے آفاقی سطح کے ایک دینی تعلیمی مرکز کے قیام اور اس کی ضرورتوں پر ایسی حیات آفریں روح پرور اور ولولہ انگیز تقریر فرمائی کہ سارا مجمع جذبات کے ترنگ میں ڈوب گیا۔ اخیر میں انہوں نے بنیادوں پر دیوار اٹھانے کے لیے چندوں کی اپیل کی۔ لوگ امنڈتے ہوئے بادلوں کی طرح ہاتھوں پر اپنے سروں کا نذرانہ لیے ہوئے اسٹیج کی طرف بڑھنے لگے اور سید العلماء کے قدموں میں نوٹوں کا انبار لگا دیا۔

دوسرے دن کے اجلاس میں ہم نے حضور حافظ ملت کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ روپیوں کا نہیں کمروں کا چندہ ہونا چاہیے۔ میری اس تجویز کو حافظ ملت نے اپنی فیروزمند مسکراہٹ کے ساتھ قبول فرمایا۔ رات کے اجلاس میں لاگت کی تفصیل کے ساتھ جب کمرے کے لیے لوگوں سے اپیل کی گئی تو سب سے پہلے مبارکپور کے سرفروش مسلمان اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھے۔ اس کے بعد باہر سے آئے ہوئے حوصلہ مند

مسلمانوں نے کئی کمروں کی پیش کش کی۔

تین دن تک مبارکپور رنگ ونور میں ڈوبا ہوا خوابوں کا ایک شہر بن گیا تھا۔ مقامی اور بیرونی مسلمانوں کے دلوں پر اس کانفرنس نے جو اپنے گہرے نقوش چھوڑے وہ کئی سال تک زندہ رہے۔

لوگوں نے ماتھے کی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ایک بوڑھے مجاہد کے جذبۂ اخلاص نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ آندھیوں کی زد پر چراغ جلانے کا محاورہ لوگوں نے سنا تھا لیکن سنگ بنیاد کی اس معرکہ خیز تقریب میں کھلی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرلیا۔ مشکلات کی زنجیروں کو جنبش لب سے کٹتے ہوئے اگر کسی نے دیکھا ہے تو حلف کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس کا عینی شاہد ہوں۔

؎ عشق ازیں بسیار کردست وکند

سہ روزہ تعلیمی کانفرنس کے ذریعہ دلوں کی سرزمین اتنی نم ہوگئی تھی کہ بس دانہ ڈالنے کی دیر تھی۔ اپنی ملت کے لیے ایک روشن مستقبل کی تعمیر کے سوال پر قوم کے آگے دست سوال دراز کرتے ہوئے حافظ ملت نے اپنی شخصیت کے وقار اور اپنے علم وتقویٰ کی جلالت وجبروت کو کبھی حائل نہیں ہونے دیا۔

وہ فرمایا کرتے تھے کہ اپنی عزت کچھ نہیں اصل عزت دین کی ہے......... دین ہی کی جلالت شان سے ہماری شان ہے..........وہ عظمت کس کام کی جو دین کی عظمت کے لیے استعمال نہ کی جائے.......دین کے لیے زبان کھولنے یا ہاتھ پھیلانے سے وقعت گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی ہے۔

چنانچہ اسی جذبہ جنوں خیز کے زیر اثر تعمیر کے لیے ضروریات کی فراہمی کا ملک گیر پیمانے پر ایک منصوبہ حافظ ملت نے تیار کیا۔ اس مہم پر حافظ ملت کی سرکردگی میں سب سے پہلا وفد جمشید پور پہنچا۔ مدرسہ فیض العلوم میں ہم نے عمائدین اہل سنت کی ایک میٹنگ

طلب کی۔ جب سارے لوگ جمع ہو گئے تو ہم نے نہایت اختصار کے ساتھ وفد کی تشریف آوری کی غرض و غایت بیان کی۔ اس کے بعد حضور حافظ ملت نے آفاقی سطح کے ایک تعلیمی مرکز کے قیام کی ضرورت اور اس کے دائرہ کار کی وسعتوں کی نہایت مؤثر انداز میں وضاحت فرمائی۔

آخر میں مجوزہ عربی یونیورسٹی کی عمارتوں کی تعمیر کے لیے مالی تعاون پر زور دیا۔

حافظ ملت کے چند ہی کلمات سے لوگ اتنے متاثر ہوئے کہ آدھے گھنٹے میں تقریباً ایک لاکھ کی رقم فراہم ہو گئی۔ اس کے بعد یہ وفد ممبئی کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس وفد میں جمشید پور سے میں اور مولانا اسرار الحق بھی شامل ہو گئے۔

ممبئی کے دوران قیام میں حضرت علامہ مفتی عبدالمنان صاحب، قاری محمد یحیٰ صاحب اور جناب بکل صاحب بھی تشریف لے آئے۔

ممبئی اور بھیونڈی کے خطے میں اس مؤثر وفد کا اتنا پر جوش خیر مقدم ہوا کہ کام کا دائرہ کار پھیل جانے کی وجہ سے حافظ ملت کو اس خطے میں ایک مہینہ قیام کرنا پڑا۔ اس مدت میں ممبئی اور بھیونڈی کے زندہ دل اور مخیر مسلمانوں نے تعمیری مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اتنا بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کہ اپنے منصوبے کی طرف سے حضور حافظ ملت کی ساری بے چینی دور ہو گئی۔

یہ اعتراف کرتے ہوئے میں یہ مضمون ختم کرتا ہوں کہ حافظ ملت کے اندر اپنے اس عظیم مقصد کی لگن اتنی والہانہ تھی کہ الجامعۃ الاشرفیہ اور حافظ ملت کے درمیان کوئی خط فاصل کھینچنا بہت مشکل تھا، یہاں تک کہ حافظ ملت کا جسد خاکی بھی اسی زمین میں پیوند ہوا جسے وہ ''باغ فردوس'' میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ واضح رہے کہ ''باغ فردوس'' اشرفیہ کے قیام کا مادۂ تاریخ بھی ہے۔

آج حافظ ملت ہماری نظروں کے سامنے موجود نہیں ہیں، لیکن انہوں نے اپنے

جگر گوشہ اور خلف صدق حضرت عزیز ملت مولانا عبد الحفیظ مدظلہ العالی کو اشرفیہ کی پاسبانی اور باغبانی کے لیے اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ حافظ ملت کی دونوں نشانیاں باہم ہو گئی ہیں۔

نہ دائم آں گل رعنا چہ رنگ و بو دارد
کہ مرغ ہر چمن گفتگوئے او دارد

قائد اہل سنت حضرت علامہ ارشد القادری رحمہ اللہ

کی صحافتی زندگی کا اولین خواب

فیضان سہ ماہی

کا مطالعہ کیجئے

مسلسل مضامین

اداریہ حالات کے تناظر میں صحیح راہنمائی

جہان قاہد اہل سنت حیات قائد اہل سنت

دنیا میرے آگے غیروں کے نکتہائے نظر پر تبصرہ

اسلام اور ہماری زندگی اصلاح امت کی کوشش

بزم حکایت عشق وایمان میں ڈوبے ہوئے صفحات

بزم دانش نونہالان ملت اسلامیہ کی قلمی تربیت گاہ

مشاعرہ نعتیہ طرح مشاعرہ ....اور مزید

مدرسہ فیض العلوم دھتکیڈیھہ جمشیدپور جھارکھنڈ انڈیا

Phone: 00-91-657-2228277

محسن ملت

حضرت علامہ شاہ

محمد حامد علی فاروقی علیہ الرحمہ

سینچا ہے اسے خون سے ہم تشنہ لبوں نے
تب جا کے اس انداز کا میخانہ بنا ہے

حضرت محسن ملت
جدوجہد کی ایک تاریخ

اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ آج ملک کا مذہبی اسٹیج اہل سنت کے ہاتھوں میں ہے جب کہ پریس پر ہمارے حریفوں کا قبضہ ہے۔ ضرورت چونکہ ایجاد کی ماں ہوتی ہے، اس لیے تقریر و خطابت کے مقابلے قلمی خدمات اور تصنیف و تالیف کی طرف ہمارے علماء کی توجہ بہت کم رہی ہے۔ اس غفلت و کوتاہی سے ہمیں سب سے بڑا نقصان یہ پہنچا ہے کہ ہماری دینی، علمی، تبلیغی اور سیاسی خدمات کا بیشتر حصہ قلمبند نہ ہونے کی وجہ سے ضائع ہو گیا اور اپنے کارناموں کے مطابق تاریخ میں ہمیں جو قرار واقعی جگہ ملنی چاہیے تھی، وہ نہ مل سکی۔ ہمارے بزرگوں میں ایک تنہا مثال مجدد دین وملت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کی ہے کہ ان کے علوم و معارف کے ذخائر اور ان کی آفاقی و عبقری شخصیت کے

فیوض و برکات، اور ان کے دینی، تبلیغی اور اصلاحی کارنامے اوراق میں محفوظ ہو گئے۔ اور آج دنیائے اسلام کا بہت بڑا حصہ علم و فضل اور عشق و محبت کے ان قیمتی ذخائر سے فیضیاب ہو رہا ہے۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ادھر دس پندرہ سال سے ہمارے نوجوان علماء میں اپنی پسماندگی کا احساس بیدار ہوا ہے اور انہوں نے قرطاس و قلم کی طرف بڑی سرعت کے ساتھ پیش قدمی کی ہے۔ اب ہماری لائبریریوں اور کتب خانوں میں جدید اور بیش قیمت تصانیف کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔

ان نوجوان مصنفین میں گرامی قدر عزیز اور تلمیذ رشید مولانا محمد علی فاروقی خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ بے سروسامانی اور وسائل کے فقدان کے باوجود انہوں نے چھتیس گڈھ جیسی بنجر زمین میں قلمی کاشت کی ایک نئی طرح ڈال دی ہے۔ اس علاقے کی مسلم اکثریت چونکہ اردو سے نابلد ہے اور نوشت وخواند کا سارا کام ہندی میں ہوتا ہے، اس لیے انہوں نے اصلاحی اور تبلیغی قسم کے بہت سارے چھوٹے چھوٹے کتابچے تصنیف کر کے عوام کے درمیان پہنچا دیا ہے۔ متعدد اردو تصنیفات کو انہوں نے ہندی رسم الخط میں منتقل کر کے اردو سے نابلد عوام کو دین سے باخبر کرنے کے لیے وقت کا نہایت اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ اختلافی مسائل میں اردو زبان کی معرکۃ الآراء کتاب ''زلزلہ'' کو بھی انہوں نے ہندی میں منتقل کر دیا ہے۔ نشر و اشاعت کا کام جاری رکھنے کے لیے موصوف نے ''محسن ملت اکیڈمی'' کے نام سے ایک نہایت مؤثر ادارہ بھی قائم کر لیا ہے، جس کے زیر اہتمام یہ ساری کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا محمد علی فاروقی کا یہ کارنامہ بھی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ وہ بنام ''محسن ملت'' ہندی میں ایک ماہنامہ بھی رائے پور سے شائع کر رہے ہیں۔ موصوف کی زبانی یہ معلوم کر کے مجھے انتہائی حیرت ہوئی کہ ادارت اور طباعت و ترسیل

کا سارا کام ان کے مدرسہ "اصلاح المسلمین ودار الیتامیٰ رائے پور" کے طلبہ انجام دیتے ہیں۔ میں واضح طور پر یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس خصوص میں ان کے مدرسہ کے طلباء اہل سنت کے سارے مدارس میں ایک ممتاز اور قابل فخر کردار کے حامل ہیں۔ موصوف ہی کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ ماہنامہ کی اشاعت دو ہزار تک پہنچ گئی ہے اور ملک کے بیشتر حصوں میں وہ نہایت ذوق وشوق کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

ایک عرصہ دراز سے اپنے جد امجد محسن ملت حضرت مولانا شاہ محمد حامد علی صاحب فاروقی علیہ الرحمۃ والرضوان بانی "مدرسہ اصلاح المسلمین ودار الیتامیٰ رائے پور" کے متعلق حضرت مولانا محمد علی فاروقی کا اصرار تھا کہ ان کی زندگی پر میں ایک جامع مضمون لکھ دوں۔ مجھے افسوس ہے کہ اپنی گوں ناگوں مصروفیات کی وجہ سے میں اب تک موصوف کی اس خواہش کی تکمیل نہیں کر سکا، لیکن آج میں طے کر کے بیٹھا ہوں کہ اس موضوع پر مجھے کچھ نہ کچھ ضرور لکھنا ہے۔

محسن ملت حضرت مولانا حامد علی فاروقی علیہ الرحمۃ والرضوان ان خوش نصیب اور قابل رشک علماء میں سے ہیں جنہوں نے اعلیٰ حضرت امام اہل سنت کی زیارت کی اور ان کے حلقۂ درس میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔ حضرت محسن ملت نے مجھ سے خود بیان کیا کہ جب افتاء اور تصنیف کا کام بہت زیادہ بڑھ گیا تو اعلیٰ حضرت نے تدریس کی ذمہ داری اپنے خلف اکبر حجۃ الاسلام حضرت مولانا شاہ مفتی حامد رضا خاں علیہ الرحمۃ والرضوان کے سپرد کری۔ چنانچہ حضرت محسن ملت کی درسیات کی تکمیل حضرت حجۃ الاسلام کے ذریعہ عمل میں آئی اور "جامعہ منظر اسلام" میں ان کی دستار بندی ہوئی۔ حضرت محسن ملت کے بیان کے مطابق ان کی سند پر اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کے دستخط بھی ثبت تھے۔

حضرت محسن ملت کی رفاقت میں کم وبیش پندرہ سال تک جماعتی کام کرنے کا

مجھے موقعہ ملا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ وہ ''آل انڈیا مسلم متحدہ محاذ'' کے جنرل سکریڑی تھے اور میں ناظم نشر واشاعت تھا۔ اس تنظیم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس وقت اہل سنت کے دل ودماغ اس کے پرچم کے نیچے جمع ہوگئے تھے۔ اس طویل عرصہ میں حضرت محسن ملت کو میں نے بہت قریب سے دیکھا اور مختلف رخ سے دیکھا اور ایک بار نہیں بار بار دیکھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ سفر کی حالت میں آدمی کی اصل تصویر نمایاں ہوجاتی ہے اور زندگی کی وہ ساری کمزوریاں جن پر تکلفات کے پردے پڑے رہتے ہیں، سفر کی حالت میں بے نقاب ہوجاتی ہیں۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ حضرت محسن ملت کے ساتھ میرا بہت زیادہ سابقہ سفر ہی کی حالت میں تھا، کیونکہ اس زمانے میں ''آل انڈیا مسلم متحدہ محاذ'' کی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا تھا۔ پورے ملک میں آئے دن کہیں نہ کہیں مرکزی کابینہ کی میٹنگوں اور عوامی کانفرنسوں کا سلسلہ جاری رہا کرتا تھا۔

ان سارے مراحل میں حضرت محسن ملت کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ گوں ناگوں محاسن وکمالات کی جامعیت کے اعتبار سے حیرت انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ تدبر اور سیاسی بصیرت میں ہمارے ساتھیوں کے اندر ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میٹنگوں میں کسی مسئلے پر جب بحث بہت زیادہ پیچیدہ ہوجاتی تھی تو ان کی رائے حرف آخر ہوا کرتی تھی۔

ان کی خطابت کا رنگ بھی سب سے نرالا تھا۔ کسی بھی مسئلے پر جب وہ تقریر کرتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ ان کی آواز میں دلوں کو پگھلا دینے والی حرارت شامل ہوگئی ہے۔ کبھی کبھی تقریر کے دوران وہ اتنا متکیف ہوجاتے کہ خود ہی رونے لگتے اور آواز گلوگیر ہوجاتی۔

ان کی اس طرح کی بے خودی کی ایک کیفیت ہم نے ''کل ہند سنی اوقاف

کانفرنس دہلی'' کے موقعہ پر دیکھا تھا۔ یہ کانفرنس لال قلعہ کے پریڈ گراؤنڈ میں ۱۹۶۰ء میں '' آل انڈیا مسلم متحدہ محاذ'' کے زیر اہتمام منعقد ہوئی تھی۔ مولانا خود اس کے جنرل سکریٹری تھے۔ سنی اوقاف کے تحفظ کے سلسلے میں وہ ایک تجویز پر تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو ان کے جذبات کے تلاطم کا عجیب عالم تھا۔ دہلی کی حکومت کو سنی اوقاف کی بربادی کا ملزم قرار دیتے ہوئے انہوں نے ایسی پر جوش تقریر کی کی نعرۂ تحسین سے سارا پنڈال گونج اٹھا اور ان پر ایسی بے خودی طاری تھی کہ تقریر کرتے ہوئے وہ مائک سے بہت دور ہٹ گئے اور انہیں ذرا محسوس نہیں ہو سکا۔ جب مجمع کے ایک گوشے سے آواز آئی تو انہیں ہوش آیا۔

سیاسی بصیرت کے علاوہ قانون کی نزاکتوں پر بھی مولانا بہت گہری نظر رکھتے تھے۔ عموماً تجاویز کا مسودہ میں ہی تیار کیا کرتا تھا۔ جب مولانا تجویز کی عبارت پر ترمیم کرتے اور مسکراتے ہوئے اس کے وجوہات بیان کرتے تو ہمیں محسوس ہوتا کہ اچانک ہم اندھیرے سے اجالے میں آ گئے۔ افسوس کہ مولانا کی سیاسی زندگی کا بہت بڑا حصہ ان کے مذہبی سرگرمیوں کے انبار میں دب گیا، ورنہ مولانا محمد علی جوہر کے دوش بدوش خلافت کمیٹی کے زمانے میں ملک کی آزادی کے لیے اپنی قربانیوں اور جیل کی زندگی کے جو واقعات وہ ہمیں سنایا کرتے تھے، اگر وہ قلم بند ہو گئے ہوتے تو جنگ آزادی کی تاریخ کی ایک اہم کڑی ہمارے ہاتھوں سے ضائع نہ ہوتی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ مولانا کے تعلقات بہت پرانے تھے۔ ہم وطن ہونے کی حیثیت سے بھی اور رفیق کار ہونے کی حیثیت سے بھی۔ اور شری لال بہادر شاستری سے تو ان کے بالکل گھریلو تعلقات تھے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ شاستری جی کی مکتب کی تعلیم اپنے گاؤں میں مولانا کے خسر صاحب سے ہوئی تھی، جو اردو زبان کے بہترین منشی تھے۔ شاستری جی نے اردو لکھنا پڑھنا انہیں سے سیکھا تھا۔ شاستری جی نے ساری عمر اس رشتے کا احترام کیا۔ اس تعلق کی بنیاد پر شاستری جی

مولانا کے لیے اکثر و بیشتر تحائف بھی بھیجا کرتے تھے۔

مذہبی دنیا میں بھی حضرت محسن ملت علیہ الرحمہ کا بہت بلند مقام تھا۔ وہ اہل سنت کے قائدین میں شمار کیے جاتے تھے۔ انہوں نے جس زمانے میں چھتیس گڈھ کو اپنی مذہبی، تبلیغی اور اصلاحی سرگرمیوں کا مرکز بنایا وہ علمی اور مذہبی اعتبار سے اس علاقے کا بہت ہی تاریک دور تھا۔ اس علاقے میں علمی اور دینی شعور برپا کرنے کے لیے بڑے سنگین مراحل سے گزرنا پڑا۔ سالہا سال کی قربانیوں اور پرسوز جد و جہد کے بعد اس علاقے میں دین وسنیت کی بہار آئی۔

مولانا نے سب سے پہلے "مدرسہ اصلاح المسلمین ودار الیتامیٰ" کے نام سے رائے پور میں ایک رہائشی قسم کا دینی تعلیمی ادارہ قائم کیا اور آس پاس کے اضلاع اور قرب وجوار کے یتیم ونادار بچوں کو خورد ونوش کی کفالت کے ساتھ اپنے مدرسہ میں داخل کیا اور جب مولویوں اور حافظوں کی ایک فوج تیار ہوگئی تو انہوں نے امام کی حیثیت سے اپنے علاقے کی مسجدوں کو سنبھال لیا۔ آج چھتیس گڈھ میں مسلک اہل سنت کا جو فروغ آپ دیکھ رہے ہیں اس کی سرخی میں محسن ملت علیہ الرحمہ کے خون جگر کا بہت بڑا حصہ ہے۔ علاقے کی بنجر زمینوں میں جب تک فصلیں اگتی رہیں گی اور دانہ چننے والے چنتے رہیں گے ،اسے مولانا ہی کا مفتوحہ علاقہ کہا جاتا رہے گا۔ مولانا کی اس قرار واقعی حیثیت پر پردہ ڈالنا اور اس کے تذکرہ سے زبانیں بند رکھنا بہت بڑی ناشکری اور احسان فراموشی ہوگی۔

حضرت محسن ملت علیہ الرحمہ کی روح میں عشق وعقیدت کی چنگاری ہمیشہ دہکتی رہتی تھی ،جس کی حرارت سے میں نے بہت سے پتھروں کو پگھلتے دیکھا ہے۔ طبیعت میں سوز وگداز کی استعداد تو پہلے ہی سے موجود تھی ، اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کے فیضان صحبت نے مولانا کو کیف ومستی کے ایک عالم خود فراموش میں پہنچا دیا۔

وہ سرکار غوث الوریٰ شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جیسی والہانہ اور فداکارانہ عقیدت رکھتے تھے، بہت کم لوگوں کو ایسی سرفرازی نصیب ہوئی ہوگی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ان کے اندر قادری نسبت کا رنگ امین خزائن قادریت اعلیٰ حضرت امام اہل سنت کے فیضان صحبت سے ہی پیدا ہوا تھا۔

اعلیٰ حضرت کے فیضان صحبت کا ہی یہ اثر تھا کہ اعراس کی محافل میں ناخواندہ عوام کی مداخلت سے جو منکرات شامل ہوگئے ہیں، مولانا شد و مد کے ساتھ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ ایک بار رائے پور میں کسی بزرگ کے مزار پر عورتوں کی قوالی کا پروگرام بنالیا گیا۔ حضرت کو جب اس بات کا علم ہوا تو مولانا سر سے کفن باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ اتفاق سے انہیں ایام میں مجھے ممبئی کا ایک سفر درپیش آیا۔ میں نے مولانا کو اپنے اس پروگرام سے مطلع کردیا تھا۔ رائے پور اسٹیشن پر جب میری ٹرین پہنچی تو مولانا پلیٹ فارم پر انتظار میں کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی باغ باغ ہوگئے۔ مولانا نے عورت کی قوالی کے سلسلے میں مجھے یہاں کا سارا حال سنایا۔ آخر میں فرمایا کہ منتظمین بھی بضد ہیں کہ وہ مزار شریف پر یہ پروگرام کرکے رہیں گے اور میں نے بھی تہیہ کرلیا ہے کہ شریعت کے ناموس کے تحفظ اور عرس کے تقدس کو برقرار رکھنے کے لیے مجھے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے تو میں قدم پیچھے نہیں ہٹاؤں گا۔

دم رخصت انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھے وصیت کی کہ مقدر کی ارجمندی سے اگر میرا جذبۂ سرفروشی اپنی مراد کو پہنچ گیا تو تم میرے مدرسہ کا خیال رکھنا اور میرے یتیم بچوں کی خبرگیری کرتے رہنا۔

مولانا کے اس رقت انگیز جملے سے میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ آپ کا جذبۂ عشق و اخلاص سلامت رہے۔ ابھی وقت نہیں آیا کہ رائے پور

کے غیور مسلمان آپ کو دار کی طرف بڑھنے کے لیے چھوڑ دیں گے۔ رہ گیا وہ کام جو آپ نے مجھے سونپا ہے وہ آپ کے مرنے ہی پر موقوف نہیں، آپ کی زندگی میں بھی میں آپ کی یہ وصیت یاد رکھوں گا۔ ممبئ کی واپسی میں پھر حضرت اسٹیشن پر تشریف لائے اور مسکراتے ہوئے فرمایا کہ حضور غوث پاک اور خواجہ غریب نواز کے صدقے میں خدا نے قبول حق کے لیے منتظمین کا سینہ کھول دیا۔

حضرت محسن ملت کی افتادِ طبع ایک یہ بھی تھی کہ وہ اپنی وضع کے بہت پابند تھے۔ سفید کرتا، سفید پائجامہ، سرمئی رنگ کی صدری، سفید ٹوپی اور حیدرآبادی رومال...... پانچ اجزاء پر مشتمل مولانا یہ لباس ہفتے میں دو دن جمعہ اور پیر کو پابندی کے ساتھ زیب تن فرمایا کرتے تھے۔ سفر میں لازمی طور پر ایک زنبیل ساتھ رہتی تھی۔ ان میں ہلکی پھلکی بیماریوں کے علاج کے لیے ضرورت کی بہت ساری دوائیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ تقریر کرتے وقت مولانا صندلی رنگ کی پگڑی باندھتے تھے۔ پگڑی کے پیچ میں وہ کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے تھے، بس جیسے تیسے سر پر لپیٹ لیا کرتے تھے۔ اپنے مدرسہ کا دو ورقی اشتہار رمضان المبارک اور عید الاضحیٰ کے موقعہ پر وہ ہمیشہ شائع کرتے تھے۔ اسی میں مدرسہ کے آمد و خرچ کا گوشوارہ بھی رہا کرتا تھا۔

حضرت محسن ملت علیہ الرحمہ کی گفتگو کا انداز بھی سب سے نرالا تھا۔ وہ اپنے مقابل کی بڑی سی بڑی دلیل کو اس خوبی کے ساتھ مسکراتے ہوئے مسمار کر دیا کرتے تھے کہ آدمی ہکا بکا رہ جاتا تھا۔

آپ نہایت پابندی کے ساتھ خواجہ غریب نواز رضی اللہ عنہ کے عرس شریف میں حاضری دیا کرتے تھے۔ عرس کے لیے گھر سے نکلنے اور اجمیر شریف سے واپسی کی جو تاریخ مقرر کر لی تھی، اس میں چالیس پینتالیس برس تک سر مو فرق نہیں آیا۔

مدرسہ میں حضرت محسن ملت علیہ الرحمہ کا جو دفتری اہتمام تھا اس کی سج دھج بھی قابل دید تھی۔ ایک مصلی اور اس کے سامنے ایک لکڑی کا بکس باقی کمرے کا سارا فرش ننگا۔ بڑے سے بڑے منصب دار کے لیے اس سے زیادہ انہوں نے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا کہ ننگے فرش پر ایک چٹائی بچھادی۔

اپنے شہر ہی میں نہیں بلکہ پورے علاقے میں آپ کی حیثیت ایک عظیم قائد اور مدبر کی تھی۔ مسلمانوں کے مسائل میں مدھیہ پردیش کی حکومت بھی مولانا کی اہمیت محسوس کرتی تھی۔ شہر اور علاقہ کے مسلمان بھی اپنے چھوٹے بڑے سارے مسائل میں مولانا کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ مولانا نے کبھی اور کسی حال میں بھی کسی ضرورت مند کو مایوس نہیں ہونے دیا۔ وہ ہر شخص کے زخموں پر تسکین کا مرہم رکھتے تھے اور ہر شخص کے کام آتے تھے۔

اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ محفوظ رہے گی کہ ریاستی اور مرکزی حکومت میں مولانا کا جو اثر ورسوخ تھا اگر مولانا چاہتے تو اپنے اور اپنے خاندان کے لیے بہت سی مراعات حاصل کر سکتے تھے، لیکن مولانا نے پورے استغناء کے ساتھ ایک درویش کی سی زندگی گذاردی۔

بہت رواروی میں یہ چند سطریں ہم نے قلمبند کردی ہیں۔ آئندہ اگر موقع ملا تو تفصیل کے ساتھ حضرت محسن ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کی مذہبی، تبلیغی اور سیاسی خدمات پر ایک طویل مضمون لکھوں گا۔

وہ محسن ملت........ جنہوں نے وسط ہندوستان میں علم وفکر اور شعور وآگہی کا وہ چراغ جلایا، جس کی روشنی سے ایک عالم جگمگا رہا ہے۔

وہ محسن ملت........ جو مسلک اعلیٰ حضرت کے فروغ اور سنیت کی حفاظت کے

لیے شمع کی طرح پگھلتے رہے.........مگر!

ہمیں نہایت قلق ہے کہ مولانا جیسی ہمہ گیر اور عظیم شخصیت، پر جس نے نصف صدی تک ہندوستان کے قلب میں بیٹھ کر اسلام و سنیت کی جو جوت جگائی، اس پر ہمارے کسی صاحب قلم نے ابھی تک کچھ نہیں لکھا۔

☆☆☆

10

شیخ المشائخ

الحاج شاہ محمد تیغ علی رضی اللہ عنہ

اس پہ کھل جائے ابھی تیغ علی کا جوہر
چشم ساقی کی اگر کوئی نظر پہچانے

علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ

حیات شیخ المشائخ حضرت محبوب الاولیاء

الحاج شاہ محمد تیغ علی قدس سرہ

اسم گرامی............شاہ محمد تیغ علی

لقب...............شیخ المشائخ، سرکار اقدس

وطن مالوف.........موضع گوریارہ ضلع مظفر پور بہار

ولادت............ ۱۳۰۰ھ

وفات...............یکم ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ

مدفن...............موضع سرکا نہی شریف ضلع مظفر پور

دیدۂ شوق کو دعوت نظارہ

حضرت شیخ المشائخ موجودہ صدی میں فضل خداوندی اور عشق وعرفان کی ایک ایسی کھلی ہوئی نشانی تھے کہ پہلی ہی نظر میں دیکھنے والوں کا یقین چیخ اٹھتا تھا کہ وہ اللہ کا ولی

ہے۔ ان کی ولایت وخدا شناسی کے لیے یہ دلیل سب پر بھاری ہے کہ ان کی ایک نگہ التفات سے دلوں کے بیشمار ویرانے آباد ہوئے۔ روح کے چمنستانوں میں بہار آئی اور لاکھوں بھٹکے ہوئے انسان ''مردان خدا'' کے گروہ میں شامل ہو گئے۔

گو وہ آج نظر کے سامنے نہیں ہیں، لیکن ان کا باطنی فیضان آسمان کے بادل کی طرح دلوں کے آفاق پر چھاتا جا رہا ہے۔ ان کے سلسلے کے غلاموں کا باطنی کیف اہل باطن ہی جان سکتے ہیں لیکن ظاہری حال اتنا آراستہ ہے کہ بیساختہ ایک مردمؤمن کی تصویر نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ ظاہر کا یہ انقلاب بلاشبہ باطن کی صحت مندی اور روح کی طہارت وآرائش کی نشاندہی کرتا ہے۔

حضرت شیخ المشائخ کے قدردانوں کی صف میں صرف عوام ہی نہیں ہیں، وہ اہل علم خواص بھی ہیں جن کی دینی برتری، مذہبی پیشوائی اور دیانت وثقاہت پر زمانہ اعتماد کرتا ہے۔ مثال کے طور پر تاجدار اہل سنت شہزادۂ اعلیٰ حضرت سرکار مفتی اعظم ہند دامت برکاتہم القدسیہ، امام المفسرین حضرت صدرالافاضل مولانا شاہ حکیم نعیم الدین صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ، فقیہ اعظم حضرت صدرالشریعہ مولانا شاہ حکیم ابوالعلا امجد علی صاحب قبلہ مصنف بہار شریعت رحمۃ اللہ علیہ، محدث اعظم ہند حضرت مولانا شاہ سید محمد صاحب کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ملک العلماء مولانا شاہ ظفر الدین احمد صاحب فاضل بہاری رحمۃ اللہ علیہ، بحر العلوم حضرت مولانا عبدالحفیظ صاحب مفتی آگرہ رحمۃ اللہ علیہ، حضرت استاذ العلماء مولانا شاہ حافظ عبدالعزیز صاحب قبلہ شیخ الحدیث اشرفیہ مبارکپور، حضرت مجاہد ملت مولانا الحاج شاہ محمد حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ، سلطان المناظرین حضرت مولانا الحاج شاہ محمد رفاقت حسین صاحب قبلہ وغیرہم۔

دنیائے اسلام کے یہ سارے مشاہیر حضرت شیخ المشائخ کی روحانیت وولایت سے متاثر ہیں۔ یہ حضرات نہ صرف یہ کہ علم وحکمت کی امامت کے منصب پر فائز ہیں بلکہ اپنی اپنی

جگہ پر خود بھی روحانیت وطریقت کے آفتاب وماہتاب ہیں۔اس لیے ان کی شہادتیں ایک جانکار اور باخبر کی شہادت کے اعتبار سے بہت زیادہ قابل اعتماد اور مستند ہیں۔

ان حالات میں فطری طور پر ہر شخص کے دل میں حضرت شیخ المشائخ کے متعلق یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوگی کہ وہ کون تھے؟............کہاں پیدا ہوئے؟............ تصوف وطریقت کے کس خانوادے سے ان کا تعلق تھا؟.........اور ان کی زندگی کے عام حالات کیا تھے؟

ویسے حضرت شیخ المشائخ کی زندگی پر کئی مفید کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ان میں سے خاص طور پر مظاہر قطب الانام، انوار صوفیہ، ہدایت المریدین اور اعزاز قادری قابل ذکر اور مستند کتابیں ہیں اور ان ثقہ حضرات کی چشم دید روایات پر مشتمل ہیں جو حضرت شیخ المشائخ کی حیات ظاہری میں شب وروز ان کی بارگاہ کے حاضر باش تھے۔اس لیے یہ کتابیں براہ راست حضرت شیخ المشائخ کے حالات سے ہمیں روشناس کراتی ہیں۔اب آنے والے دور میں جو بھی حضرت کی حیات طیبہ پر قلم اٹھائے گا ان کتابوں کو اصل ماخذ کی حیثیت سے سامنے رکھنا ناگزیر ہوگا۔

خدا کا شکر ہے کہ ان کتابوں کے مصنفین وجامعین خود بھی اہل علم اور اصحاب قلم ہیں بالخصوص حضرت مولانا شاہ محمد حنیف صاحب، حضرت مولانا ش. محمد علاء الدین صاحب اور فاضل نوجوان حضرت مولانا جید القادری صاحب۔ یہ سب کے سب تیغی سلسلہ کے مشاہیر اہل علم ہیں۔ان حضرات کی تحریریں پڑھ کر معلومات کی وسعت اور زبان وقلم کی سلامت روی کا یقین جاگ اٹھتا ہے۔

ہندو پاک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے تیغی حلقوں میں مرید باصفا جناب صوفی شاہ قربان علی صاحب تیغی کی ادائے عاشقانہ ضرب المثل بن چکی ہے۔شیخ کے چمنستان عقیدت کے لیے ان کے جگر کے خون کا کوئی آخری قطرہ بھی طلب کرے تو انہیں

ذرا بھی دریغ نہ ہوگا۔ وہ اپنی زندگی اور زندگی کی پوری کائنات شیخ کے قدموں میں نثار کر چکے ہیں۔

ادارۂ جام نور کے سرپرست ہونے کی حیثیت سے ان کی یہ خواہش قابل احترام ہے کہ عرس شریف کے موقعہ پر ''تیغی نمبر'' کا خراج عقیدت صاحب عرس کی بارگاہ میں پیش کیا جائے۔

جولائی کا یہ ''جام نور'' جو سرکار کی زندگی کے مختلف گوشوں پر حاوی ہے، تیغی برادران طریقت کے لیے تسکین قلب وروح کا بہترین ذریعہ ہے۔ اب ذیل میں حضرت علیہ الرحمہ کے متعلق چند بکھرے ہوئے گلہائے عقیدت ملاحظہ فرمائیں۔

سلسلۂ طریقت

سینکڑوں برس کی بات ہے کہ سیالکوٹ پنجاب میں امام طریقت حضرت صوفی شاہ آبادانی رحمۃ اللہ علیہ نام کے ایک بزرگ گذرے، جن سے سلسلۂ آبادانیہ کی شاخ پھوٹی۔ اپنے سلسلے کے امتیاز کے لیے انہوں نے سیاہ رنگ کا ایک رومال ایجاد کیا جس کے چاروں گوشوں پر نقطے والے نقوش بنے ہوئے ہیں۔ سلسلۂ آبادانیہ میں مرید ہونے والوں کو آج بھی یہ رومال دیا جاتا ہے۔ رومال کے چاروں گوشوں پر جو پھول بنے ہوئے ہیں، اہل باطن انہیں چہار رموز کی علامت سے تعبیر کرتے ہیں۔

حضرت صوفی شاہ آبادانی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ اوپر کی طرف ساتویں کڑی میں حضرت امام احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے جب کہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی کا سلسلہ مبارکہ ۲۹ ویں کڑی میں سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قدسی صفات تک منتہی ہوتا ہے۔

حضرت صوفی شاہ آبادانی رحمۃ اللہ علیہ کے نیچے تیسرے شیخ الطائفہ حضرت عظیم

البرکت مولانا سید شاہ فریدالدین رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کا مزار مبارک محلہ میر گنج شہر آرہ میں ہے۔ ان کے بارہ خلفاء مشہور ہیں۔ خلیفۂ ششم حضرت شیخ الطریقہ مولانا شاہ سمیع احمد صاحب مونگیری رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت شیخ المشائخ کو بیعت ارشاد حاصل ہے۔ اور خلیفۂ دوازدہم حضرت صوفی شاہ حکیم سید جلال الدین جڑہوی رحمۃ اللہ علیہ نے اجازت وخلافت مرحمت فرمائی ہے۔ اس لیے حضرت فریدی بھی ہیں اور چونکہ خانقاہ پھلواری کے سجادہ نشیں حضرت مولانا سید شاہ محی الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خانوادۂ مجیبیہ کے جملہ سلاسل کی اجازت آپ کو عنایت فرمائی تھی، اس لیے حضرت شیخ المشائخ اپنے آپ کو مجیبی بھی لکھتے اور کہتے تھے۔

اس طرح حضرت شیخ المشائخ آبادانی، فریدی اور مجیبی ہیں .... لیکن خانقاہ شریف آبادانی سے منسوب ہیں۔

عہد طفلی

کسی بھی بڑے انسان کی سوانح حیات میں اس کے عہد طفلی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ فطرت بغیر کسی حجاب وواسطہ کے اس کی عظمتوں کی نشاندہی کرتی ہے۔

حضرت شیخ المشائخ کی والدہ ماجدہ رحمۃ اللہ علیہا اپنے لخت جگر کے ابتدائی حالات بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ اکثر ایسا ہوتا کہ میری گود سے اتر کی کسی اندھیرے مکان کے گوشے میں وہ دوزانو بیٹھ جاتے اور انگلیوں پر کچھ گنتے رہتے۔ کبھی آسمان کی طرف انگلیوں کا اشارہ کرتے۔ راتوں کو جب مجھے نیند آجاتی تو میرے پہلو سے اٹھ کر پائنتی کی طرف بیٹھ جاتے اور میرے پاؤں کے تلووں سے ہاتھ مس کر کے اپنے چہرے پر ملا کرتے یہاں تک کہ میری آنکھ کھل جاتی۔

فرماتی ہیں کہ اپنے بچے کے عجیب وغریب حالات دیکھ کر میں اکثر اندیشناک رہتی کہ مبادا یہ نعمت عظمیٰ کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ حالات بیان کرتے ہوئے ایک بار آنکھوں میں خوشی کے آنسو امنڈ آئے اور تحدیث نعمت کے طور پر کہنے لگیں کہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے میری کوکھ سے ایک ہونہار ولی پیدا فرمایا۔

ایک مجذوب سے ملاقات

اولیاء کاملین کی سوانح زندگی میں کسی نہ کسی مجذوب سے ملاقات کا واقعہ ضرور ملتا ہے۔ واقعات کا یہ التزام مصلحت سے خالی نہیں ہے۔ کسی لکڑی کو سلگانے کے لیے اگر آگ کا اتصال ضروری ہے تو عشق الٰہی کے سوز وتپش سے دلوں کو گرمانے کے لیے یقیناً کسی آتشکدے کے قریب جانا ہوگا۔

چنانچہ حضرت شیخ المشائخ کو بھی اس راہ سے گذرنا پڑا۔ مظفر پور کے مشہور مجذوب حضرت داتا کمبل شاہ رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی ملاقات اور ان کی طرف داتا صاحب کی رازدارانہ توجہ حضرت شیخ المشائخ کے عہد طالب علمی کا نہایت مشہور واقعہ ہے۔

زمانۂ تعلیم کا ایک عجیب وغریب واقعہ

جس زمانے میں آپ مولوی سبحان علی صاحب مرحوم کے حلقۂ درس میں ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے، اس وقت کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ استاد نے فارسی بنانے کے لیے اردو کے چند جملے دیئے۔ ان میں سے ایک جملہ یہ بھی تھا ”ڈھنڈھورا شہر میں لڑکا بغل میں“۔ حضرت شیخ المشائخ علیہ الرحمہ نے اس جملہ کا جو ترجمہ فرمایا اس نے مستقبل کے چہرے سے سارے نقاب الٹ کر رکھ دیئے۔ کاپی پر نگاہ ڈالتے ہی استاد کی روح جھوم اٹھی اور بے اختیار زبان سے یہ جملہ نکلا ”بلاشبہ یہ لڑکا اپنے زمانے میں یکتائے روزگار اور

دانائے اسرار ہوگا''۔

ترجمہ یہ تھا: ''خدا نزد است می جوید بہ صحرا'' یعنی خدا قریب ہے اور لوگ اسے صحرا میں ڈھونڈھتے ہیں۔

یہ صرف ترجمہ ہی نہیں تھا اپنے واردات کی ترجمانی بھی تھی۔

ابتدائی تعلیم مکمل ہو جانے کے بعد آپ اپنے عم محترم جناب اکبر علی صاحب مرحوم کے ہمراہ کلکتہ تشریف لائے اور مدرسہ عالیہ میں داخل ہو گئے۔ فارسی کی معیاری کتابیں ختم کر لینے کے بعد درجۂ عربی میں داخلہ ہوا۔ ابھی زیرِ تعلیم ہی تھے کہ والد ماجد علیہ الرحمہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور چار و ناچار سلسلۂ تعلیم ختم کر دینا پڑا اور کاشتکاری کے کاروبار کی نگرانی کے لیے آپ کے چچا نے آپ کو مکان بھیج دیا۔ کتب بینی کا شوق اور مطالعہ کا سلسلہ چونکہ زندگی کے آخری لمحے تک جاری رہا اس لیے حضرت شیخ المشائخ نے گو بظاہر درس نظامیہ کی تکمیل نہیں کی تھی لیکن معلومات کا حلقہ اتنا وسیع تھا کہ علوم ظاہری میں بھی آپ مکمل تھے۔

منزل کی طرف پہلا قدم

چند ہی سال کے بعد اپنے عم کی طلبی پر آپ نے دوبارہ کلکتہ کا سفر کیا۔ ویسے بظاہر یہ سفر طلب معاش کے لیے تھا لیکن مشیت الٰہی کچھ اور انتظام کر چکی تھی۔ خضرِ راہ سے ملاقات کے لیے کلکتہ ہی کی سرزمین علم الٰہی میں مقدر ہو چکی تھی۔ یہیں سے زندگی کا وہ دور شروع ہوا جس نے دیہاتی گھرانے میں جنم لینے والے ایک گمنام کو اپنے وقت کا شیخ المشائخ بنا دیا۔

بچپن ہی سے اوراد و اذکار اور نماز و تسبیح سے جو قلبی لگاؤ اور روحانی ذوق تھا، اب وہ نقطۂ شباب پر پہنچ چکا تھا۔ فرائض ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد حضرت کا سارا وقت انہی مشاغل میں گزرتا تھا۔ ٹھیک اس وقت جب کہ ایک روحانی انقلاب کے لیے باطن کی

فضا ہموار ہو چکی تھی اور ولولۂ شوق کا اضطراب دل کے دروازے پر دستک دے رہا تھا، سراج السالکین حضرت حافظ شاہ فرید الدین صاحب شاہ آبادی قدس سرہ العزیز کے خلیفۂ پنجم حضرت عظیم البرکۃ مولانا شاہ سمیع احمد صاحب مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کلکتہ رونق افروز ہوئے۔ آپ کی بزرگی اور کشف و کرامات کی ساری شہر میں دھوم مچ گئی۔ شدہ شدہ حضرت تک بھی یہ خبر پہنچی۔ بس اب کیا تھا، اچانک عشق الٰہی کا جذبۂ شوق جاگ اٹھا اور ایک نامعلوم کشش سے دل کا حال قابو سے باہر ہو گیا۔ اسی عالم میں اٹھے اور "پیر خان" کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ شیخ کے روئے تاباں پر نظر پڑتے ہی دل کا عالم بدل گیا۔ شیخ نے بھی پہلی ہی نگاہ میں سعادت وار جمندی کے وہ سارے آثار پڑھ لیے جو لوح جبیں پر جگمگا رہے تھے۔ نہایت شفقت والتفات کے ساتھ اپنے قریب بٹھایا، خیریت پوچھی اور حالات دریافت کیے۔ اسے شیخ کامل کی توجہ باطنی کا تصرف کہا جائے کہ پہلی ہی ملاقات میں حضرت شیخ المشائخ کی حالت متغیر ہو گئی۔ دل کیف و انبساط سے بھر گیا۔ بال بال سے شوق کی چنگاری پھوٹنے لگی۔ بیساختہ عرض گزار ہوئے:

"مجھے اپنے حلقۂ غلامی میں داخل کر لیا جائے۔"

وقت آ گیا تھا کہ ایک تشنہ روح کو چشمۂ عرفان تک پہنچا دیا جائے۔ اس التجائے شوق پر شیخ کامل کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ رہ عشق و طلب کے ایک ارجمند مسافر کو پا کر گویا آج منزل کا راہنما بھی اپنے تئیں مسرور تھا۔

ہاتھ پکڑا، آنکھیں بند کیں اور دیر تک محویت و استغراق کا عالم طاری رہا۔ آنکھیں کھلیں تو ایک طالب صادق کی روح کا رشتہ مشائخ سلسلہ کی ارواح طیبات سے مربوط ہو چکا تھا۔ کسے معلوم کہ اس وقفے میں کہاں کہاں کی سیر ہوئی اور ایک ہاتھ کتنے ہاتھوں سے گذرتا رہا۔ حاضرین کو صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ حضرت شیخ المشائخ جب اس مبارک مجلس سے اٹھے تو پورا سراپا دریائے کرم کی موجوں میں شرابور تھا۔

شیخ کامل نے چلتے وقت فرمایا: روز اسی وقت آیا کرو۔

باطنی دنیا میں جشن مسرت

مرشد کی بارگاہ سے سرفراز وشادکام ہوکر اپنی قیام گاہ کی طرف واپس آرہے تھے کہ اثنائے راہ ایک مجذوب سے ملاقات ہوگئی۔ نظر چار ہوتے ہی اس نے یہ شعر پڑھا:

نرگس اندر باغ حیراں از نگاہ مست تو
چشم آہو در بیاباں از نگاہ مست تو

اس کے بعد کانوں میں دیر تک یہ جملہ گونجتا رہا: ہاں جی مردوں کا یہی کام ہے۔

حضرت شیخ المشائخ اپنی ضروریات سے فارغ ہوکر جب اپنے بستر پر تشریف لے گئے تو خواب کے لیے آنکھیں بوجھل تھیں۔ چند ہی منٹ میں نیند آگئی۔ عالم بدل چکا تھا۔ سلسلے کے بزرگوں کی ارواح طیبات نے اپنی زیارتوں کا شرف بخشا اور اپنی معنوی نسل کے ایک فرزند جلیل کو چشم التفات کی پناہ گاہ میں لے لیا۔

عالم ظاہر سے لے کر عالم باطن تک ہر جگہ حضرت شیخ المشائخ کی سرفرازیوں کا خیر مقدم ہوا۔

روحانی ترقیوں کا نیا دور

جب تک مرشد کامل کلکتہ میں مقیم رہے حضرت شیخ المشائخ ہر روز بعد نماز مغرب پیادہ پا حاضر دربار ہوتے اور رات گئے تک سلسلے کے اذکار واشغال اور طریقت وسلوک کے رموز واسرار کی تعلیم حاصل کرتے۔ شیخ کے ساتھ گھنٹوں مراقب رہتے۔ حبس دم کے ساتھ ایک نشست میں بارہ ہزار ذکر نفی واثبات کی مشق پہلے ہی سے تھی، شیخ کے فیضان توجہ سے یہ صلاحیت نکھر گئی۔

حضرت شیخ المشائخ کے واقعہ بیعت کا یہ رخ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بیعت کا شرف اس وقت حاصل ہوا جب کہ شیخ کی روحانی عظمت نقطۂ انتہا پر پہنچ چکی تھی اور عالم قدس کا پیامی زندگی کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

چنانچہ کلکتہ سے رخصت ہوتے وقت شیخ کامل نے اشاروں اشاروں میں اس امر کی اطلاع دیدی تھی کہ یہ میری زندگی کے آخری لمحات ہیں، اب مجھ سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔

اس خبر سے طالب صادق کے دل پر بجلی گر پڑی۔ بیقرار ہو گئے۔ اشکبار آنکھوں کے ساتھ عرض کیا: حضور میرے لیے کیا حکم ہوتا ہے؟

آپ نے ارشاد فرمایا: اطمینان رکھو صبر سے کام لو۔ یہ جدائی عالم اجسام کی ہے، ورنہ میری روح ہر وقت تمہارے ساتھ رہے گی۔

مزید تسکین قلب کے لیے سر پر دست شفقت رکھا اور اپنے خلیفۂ راشد عارف باللہ حضرت مولا علی لعل گنجی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: تم ان کے پاس آتے جاتے رہا کرو۔ تمہاری عظمت کمال کا باقی حصہ انہی کے ذریعہ مکمل ہوگا۔

شیخ کامل اپنے عاشق زار کو تڑپتا ہوا چھوڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ چند ہی دنوں کے بعد اطلاع موصول ہوئی کہ حضرت شیخ نے ہمیشہ کے لیے داعی اجل کو لبیک کہا۔ شیخ کی مفارقت کا غم زندگی کے آخری لمحے تک رہا۔ آتش ہجر کے اٹھتے ہوئے شعلوں کو اگر شیخ کامل کے جانشیں حضرت مولا علی لعل گنجی رحمۃ اللہ علیہ نے ٹھنڈا نہ کر دیا ہوتا تو خدا ہی جانتا ہے کہ ایک عاشق دلگیر کی بے چینیوں کا کیا عالم ہوتا؟

حضرت شیخ المشائخ کے اخلاص باطنی، شوق طلب اور کسر نفسی کی یہ شان بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ پیر بھائی ہوتے ہوئے بھی شیخ کے جانشیں کو بالکل شیخ کی طرح ساری عمر مانتے رہے۔ ادب واحترام، خدمت وتواضع، تعلیم واستفادہ ہر رخ سے یہ ادا ٹپکتی رہی

کہ ایک طالب صادق اپنے شیخ کی بارگاہ میں حاضر ہے۔آپ نے اپنے مرشد کے جانشین کی جیسی خدمت کی اب خود مرشد کے حق میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

ابتدائی ایام میں حضرت شیخ المشائخ دن بھر اپنا کام کرتے اور شام کو بعد نماز مغرب مرشد کی خدمت میں حاضر ہو جاتے اور رات گئے تک اذکار و اشغال میں مصروف رہتے، لیکن ۱۳۵۰ھ میں جب کہ مرشد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور قلب مضطرب صدمات کی تاب نہ لا سکا تو سارا کاروبار یکلخت چھوڑ کر آپ اپنے شیخ کے جانشین حضرت شاہ مولا علی کی سرکار میں رہنے لگے۔

حیرت انگیز مجاہدہ

بائیس سال تک علائق دنیا سے بے تعلق ہو کر حضرت شیخ المشائخ نے جس شان سے ریاضت شاقہ کئے ہیں اور جس شیفتگی کے ساتھ مرشد کے جانشین کی خدمت انجام دی ہے، اس کی نظیر مشکل ہی سے ملے گی۔ واقعات کے چشم دید راویوں نے شب و روز کا جو معمول نقل کیا ہے، اس کا نقشہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

عشاء کی نماز اور معمولات سے فارغ ہو کر جوں ہی حضرت شاہ صاحب قبلہ بستر پر تشریف لے جاتے، آپ سر پر تیل کی مالش کرتے، پھر بدن دباتے، جب تک وہ خود چھوڑنے کو نہیں فرماتے اسی طرح خدمت کرتے رہتے۔ جب اس سے فراغت ملتی اور حضرت شاہ صاحب سو جاتے تو آپ دبے پاؤں اٹھتے اور اذکار و اشغال میں مصروف ہو جاتے۔ درمیان میں چند گھنٹے آرام کرتے، پھر تہجد کے وقت اٹھتے، اپنے شیخ کو وضو کراتے، اس کے بعد خود وضو کرتے اور حضرت شیخ کے ساتھ تہجد کی نماز پڑھتے، اس کے بعد صبح تک دونوں بزرگ شغل نوری میں مصروف رہتے۔ یوں ہی اذان کی آواز کان میں آتی تو دونوں حضرات مسجد میں پہنچ کر نماز باجماعت ادا فرماتے۔

نماز فجر کے بعد خود اپنے ہاتھوں سے ناشتے کا اہتمام فرماتے۔ جملہ حاضرین مجلس کو ناشتہ کرانے کے بعد شیخ کا جو پس خوردہ ملتا اسے خود تناول فرماتے۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب کی رنگ سازی کی دکان کھولتے اور سارا دن اس میں لگے رہتے، لیکن توجہ ہمیشہ مرشد کی طرف رہتی۔

کہتے ہیں کہ روشن ضمیری کا یہ عالم تھا کہ حضرت شاہ صاحب کو جب بھی کوئی ضرورت پیش آتی فوراً آپ کے دل پر القا ہو جاتا اور آپ کہیں بھی رہتے حاضر ہو جاتے۔ حضرت شاہ صاحب پان کے بہت عادی تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی اتفاق پیش آجاتا کہ منہ میں پان کی پیک بھر جاتی اور اگالدان نزدیک نہ ہوتا تو آپ اپنے دونوں ہاتھوں میں پیک لے کر اسے احتیاط سے کہیں ڈال دیتے۔

انہی خدمات ومجاہدات کی برکتیں تھیں کہ شاہ صاحب نے آپ کو الطاف کریمانہ سے نہال کر دیا۔ شاہ صاحب پیار سے آپ کو میاں جی کہا کرتے تھے۔ متعدد بار فرط محبت میں ارشاد فرمایا: جو میاں جی کا نہیں وہ میرا نہیں اور جو میاں جی کا دوست وہ میرا دوست۔ کسی شیخ طریقت کی بارگاہ کا یہ اعزاز معمولی نہیں ہے۔ روحانی اتصال کے بعد ہی کسی کو اس مقام کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

مسند خلافت وارشاد پر جلوہ گری

بائیس سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد جب مقامات سلوک اور روحانی مدارج کی تکمیل ہوگئی تو شیخ طریقت عارف زمانہ حضرت شاہ مولا علی رحمۃ اللہ علیہ نے پیران سلاسل کے اشارے پر بتاریخ ۲۰ر جمادی الاخری ۱۳۱۱ھ اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا شاہ سمیع احمد صاحب مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر انوار پر مجمع عام میں اپنے دست مبارک سے آپ کے سر پر دستار خلافت باندھی اور آپ کا ہاتھ پکڑے ہوئے مزار مبارک

کے قریب لے گئے اور عرض کیا:

" لیجئے! جو حضور کا حکم تھا اس کی تعمیل کر کے حاضر خدمت کر دیا۔ اب آگے سرکار کو اختیار ہے۔ "

دوسرے سال جب حضرت شیخ المشائخ خان پورا اپنے مرشد برحق کے عرس میں حاضر ہوئے تو رات کو بعد اختتام مجلس جب سارے زائرین سو گئے اور ہر طرف خموشی کا سناٹا طاری ہو گیا، آپ دبے پاؤں اٹھے اور پیر و مرشد کے مزار پر مراقب ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ مکاشفہ ہوا کہ مزار مبارک کھلا ہوا ہے اور سرکار اقدس مسکراتے ہوئے بہت سارے چھوٹے بڑے صندوق آپ کو مرحمت فرما رہے ہیں۔ اور یہ ارشاد فرماتے جاتے ہیں کہ میاں جی! یہ سب میں تمہیں دیتا ہوں۔

معرفت و اتقان کے یہی وہ گنجہائے گرانمایہ تھے جو ساری زندگی شیخ المشائخ کی سرکار سے تقسیم ہوتے رہے اور اب ان کی آرام گاہ کی چوکھٹ سے یہ باڑا بٹتا ہے۔

کشور قلوب میں ولایت کا غلغلہ

مسند ارشاد پر جلوہ گر ہونے کے بعد مشرقی ہندوستان میں آپ کی ولایت و بزرگی کا غلغلہ بلند ہو گیا....... جدھر سے گذرتے پروانوں کی بھیڑ لگی رہتی...... نگاہ پڑتے ہی دلوں کا نقشہ بدل جاتا.......... چشم زدن میں روح کی کثافت دور ہو جاتی.......... جو حلقۂ غلامی میں داخل ہو جاتا آنا فانا اس کی زندگی کی شام و سحر شریعت طاہرہ کے سانچے میں ڈھل جاتی۔

جب طالبین و ذاکرین کا ہجوم بہت زیادہ بڑھنے لگا اور آپ کے آبائی وطن موضع گوریادہ کا رہائشی مکان مہمانوں کے لیے تنگ ہو گیا تو آپ سرکانہی شریف ہجرت فرما کر آگئے اور یہاں ایک وسیع رقبۂ زمین پر خانقاہ کی بنیاد ڈال دی۔

اب اس ویرانے میں ایک چمن آباد ہے۔ شیخ المشائخ کا مزار اقدس بھی اسی سرزمین پر مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔ ایک عرصہ دراز تک اسی مقام سے آپ نے روحانی برکتوں کا خزانہ لٹایا اور لاکھوں بندگان خدا کو خداشناسی کی دولت سے مالا مال کیا۔ سینکڑوں برائیوں کا قلع قمع کیا جو مسلمانوں کے معاشرے میں داخل ہوگئی تھیں۔ باطنی تربیت اور نفس کا تزکیہ کر کے ہزاروں افراد کو باخدا بنا دیا۔ ملک کے مختلف صوبوں میں آج بھی حضرت شیخ المشائخ کے خلفاء کی بہت بڑی تعداد خدمت خلق میں مصروف ہے۔ اور نہ یہ کہ ہر شخص اپنی جگہ پر ہدایت وارشاد کا مسند نشیں ہے بلکہ خود ان کے خلفاء کا بھی ایک وسیع سلسلہ ہے جو زمین کے مختلف حصوں میں پھیلا ہوا ہے۔

یقیناً یہ ساری برکتیں حضرت شیخ المشائخ کی روحانی برتری، دینی اخلاص اور قوی ترین نسبت سلسلہ کی ہیں۔

شیخ المشائخ کا مسلک

حضرت شیخ المشائخ ایک پابند شرع اور نہایت درجہ متبع سنت بزرگ تھے۔ عبادات سے گزر کر معاملات، خورد ونوش، رہن سہن، لباس ومعاشرت اور زندگی کے تمام شعبوں میں سنت کا حد درجہ التزام فرماتے تھے۔

ایک بار سخت بیمار ہوئے۔ شدت کرب سے بستر پر کروٹ بدلتے رہے۔ اسی حالت میں پیشاب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ استنجے کے لیے پانی ساتھ تھا۔ کلوخ ہمراہ لے جانا بھول گئے تھے جوں ہی فراغت کے لیے بیٹھے، کلوخ یاد آ گیا۔ اسی حالت میں واپس چلے آئے اور کلوخ ہمراہ لے کر گئے۔

اسی طرح ایک بار بلڈ پریشر کا دورہ پڑا۔ عین شدت تکلیف میں جب رفع حاجت کے لیے بیٹھے تو یاد آ گیا کہ سر کھلا ہوا ہے۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور سر پر کچھ رکھ لیا تب

جا کر بیٹھے۔

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کے معمولی سے معمولی جزئیات میں جو آداب شرع کا اس قدر التزام رکھتا تھا، فرائض وواجبات اور سنن مؤکدات میں اس کے تقوی کا کیا حال ہوگا؟

عقائد کے سلسلے میں عام پیشہ ور پیران زمانہ کی روش کے مطابق وہ صلح کلی کے قائل نہیں تھے۔ بدمذہب، بے دین اور گستاخ فرقوں کے خلاف قولاً وعملاً نفرت و بیزاری کا اظہار کرنے میں انہیں کبھی کوئی مصلحت مانع نہیں آئی۔ غیر مقلدین وہابیہ اور دیوبندیوں سے سخت اجتناب فرماتے تھے اور متوسلین وخلفاء کو بھی ان سے علیحدہ رہنے کی نہایت سختی کے ساتھ تلقین کرتے تھے۔

اعلیٰ حضرت امام اہل سنت فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اکثر اعلی حضرت کا نعتیہ کلام پڑھوا کر سنتے اور گھنٹوں اشکبار رہتے۔

اس دور کے تمام مشاہیر علمائے اہل سنت سے آپ کے نہایت خوشگوار تعلقات تھے۔ جلسہ ہائے میلاد میں اکثر ان کے مواعظ سے محفوظ ہوا کرتے تھے۔

سرکانھی شریف میں ایک دار العلوم کا قیام

مذہب اہل سنت کے فروغ اور عقائد کی اصلاح کے لیے آپ نے سرکانہی شریف کے احاطۂ خانقاہ میں ''علمیہ انوار العلوم'' کے نام سے ایک دینی درس گاہ کی اپنی حیات ہی میں بنیاد ڈال دی تھی، جو آج ایک معیاری دار العلوم کی صورت میں پھل پھول رہی ہے۔ زیب سجادہ عالیہ حضرت صوفی شاہ محمد ابراہیم صاحب قبلہ کی سرپرستی اور فاضل نوجوان حضرت مولانا علی احمد صاحب جید القادری کی نظامت نے اسے چار چاند لگا دیے ہیں۔ یہ درسگاہ سلسلہ تیغیہ کی علمی برکتوں کا ایک واضح نشان ہے۔ درسگاہ کے نظم ونسق اور

اغراض ومقاصد کے سلسلے میں حضرت شیخ المشائخ کا ایک تاریخی وصیت نامہ بھی ہے جو نہایت جامع ہے اوران شرائط پر مشتمل ہے جس کی رو سے کوئی بدعقیدہ اس کے نظم ونسق میں دخیل نہیں ہوسکتا۔ وہ وصیت نامہ میری نظر سے گذر چکا ہے۔وصیت نامے پر بطور گواہ حضرت ملک العلماء مولانا شاہ ظفر الدین صاحب قادری رضوی بہاری قدس سرہ العزیز اور بحر العلوم حضرت مولانا مفتی عبدالحفیظ صاحب سابق مفتی آگرہ رحمۃ اللہ علیہ کے دستخط ثبت ہیں۔

اپنے علاقے میں ''علیمیہ انوار العلوم'' اس وقت اہل سنت کا ایک محفوظ قلعہ اور حضرت شیخ المشائخ کی روحانی امنگوں کی ایک عظیم یادگار ہے۔

کشف وکرامات

حسن اعتقاد کے ساتھ اتباع سنت، پابندی شرع اور التزام تقویٰ.........یہی ہیں وہ چند علامات، جن کے ذریعہ کسی ولی کی شناخت ہوتی ہے۔کشف وکرامات اور خوارق عادات کا ظہور اگرچہ مدار ثبوت نہیں ہے، لیکن سنت الٰہی اسی طرح پہ جاری ہے کہ وہ اپنے مقرب بندوں کو عالم میں تصرف کرنے کی قوت عطا فرماتا ہے اور وہ خدا کی عطا سے خلاف عادت امور کا اظہار فرماتے ہیں۔اسی کو اصطلاح شرع میں ''کرامت'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ویسے تو حضرت شیخ المشائخ کی سب سے بڑی کرامت ان کا تقوی اور ان کی متشرع زندگی ہے، لیکن یہ بھی خدا کا فضل ہے کہ حضرت سے بے شمار کرامات کا صدور ہوا ہے۔ذیل میں چند مستند اور مشہور کراموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

روشنی اور آواز

حضرت شیخ المشائخ کی اہلیہ محترمہ بیان کرتی ہیں کہ ایک رات کو میں اپنی خواب گاہ سے باہر نکلی۔ جس حجرے میں بیٹھ کر آپ عبادت و ریاضت کیا کرتے تھے، میں نے دیکھا کہ وہ بقعۂ نور بنا ہوا ہے اور اندر کوئی انتہائی ہیبت ناک آواز میں آپ سے باتیں کر رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میں خوفزدہ ہوگئی۔ بدن پر لرزہ طاری ہوگیا۔ الٹے پاؤں واپس ہی ہونا چاہتی تھی کہ اندر سے حضرت تشریف لائے اور مجھے تسلی دی۔ میں نے جب دریافت کیا کہ وہ روشنی کیسی تھی تو آپ نے ہنس کر اسے ٹال دیا اور فرمایا کہ جاؤ سو جاؤ۔ ابھی رات زیادہ ہے۔

جس راز کو خود حضرت شیخ المشائخ نے واشگاف نہیں کیا، اس کی تشریح کون کر سکتا ہے۔ البتہ اہل اللہ کی سوانح حیات میں اس طرح کے بیشتر واقعات ملتے ہیں کہ رات کی تنہائیوں میں فرشتگان رحمت، رجال الغیب، احسنۂ صالحین اور ارواح طیبات سے گفتگو اور ملاقاتوں کے اتفاقات پیش آئے ہیں۔

نیاز مندوں کی چارہ گری

''مظاہر قطب الانام'' کے مؤلف حافظ شاہ محمد حنیف صاحب قادری تیغی بیان کرتے ہیں کہ ایک بار موضع چین پور ضلع مظفر پور میں زبردست ہیضہ آیا اور کثرت سے اموات ہونے لگیں۔ سارے علاقے میں خوف ودہشت کا سناٹا چھا گیا۔ اکثر ایسے مواقع پر غفلت کا نشہ اتر جاتا ہے اور چارہ گری کے لیے خدا کے دیندار بندوں کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت سرکار کی نسبت سے بہت سے لوگ مجھ سے بھی مانوس تھے۔ پریشانی کے عالم میں لوگوں نے میرے پاس اطلاع بھیجی کہ چین پور اس وقت تباہی کے

دہانے پر ہے لہٰذا آپ فوراً آیئے۔

حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ احباب واقارب نے ہزار مجھے منع کیا، لیکن میں وہاں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جوں ہی اس گاؤں کے قریب پہنچا لوگ ہجوم در ہجوم میرے قریب جمع ہو گئے اور اپنے اپنے حادثوں کی روداد سنانے لگے۔ اموات کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ چند مخلصین کے مجبور کرنے پر میں گاؤں کے باہر ہی ایک گودام میں ٹھہر گیا۔ تکان اور نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں، جیسے ہی لیٹا نیند آ گئی۔

فرماتے ہیں کہ اس نیند کی لذت آج تک نہیں بھولتی۔ جوں ہی آنکھ لگی دیکھا کہ سرکار قبلہ سامنے جلوہ گر ہیں اور فرما رہے ہیں کہ

"حافظ صاحب! گھبرایئے مت، آپ چین پور ضرور جایئے اور فلاں فلاں ترکیب کر ڈالئے۔ میں نے دربار غوثیت میں درخواست پیش کر دی ہے، جو ہونا تھا وہ ہو گیا اب کچھ نہیں ہو گا انشاء اللہ ...... البتہ پرانے مریضوں میں سے دو آدمی جن کا آخری وقت آ گیا ہے، وہ جانبر نہیں ہو سکیں گے۔"

حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ سرکار قبلہ کی بشارت کے مطابق اس کے بعد سے چین پور والوں کو اس ہلاکت خیز وبا سے چین مل گیا۔

مرشد کامل صرف ایمان ویقین ہی کا نگراں نہیں ہوتا، دنیوی آفات کا بھی چارہ گر ہوتا ہے اور جہاں بھی ہو، اس کی روشن ضمیری اپنے غلاموں کے حالات سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں رہتی۔

نازبندگی

کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت شیخ المشائخ اپنی خانقاہ میں جلوہ افروز تھے۔ مکئی کی فصل کا موسم تھا، لیکن بارش نہ ہونے کی وجہ سے سارے علاقہ میں کہرام مچا ہوا تھا۔ ساری

فصل مرنے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اسی اثناء میں پڑوس کا ایک برہمن حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

"بابا! یہ کیا ہو رہا ہے۔ آپ کے رہتے ہوئے یہاں کی زمین پیاس سے تپ رہی ہے۔ کھیت جھلس کے رہ گئے ہیں۔ دعا کے لیے آپ کے ہاتھ کب اٹھیں گے۔"

راوی کا بیان ہے کہ خانقاہ کے سائبان کے نیچے مکئی کے کئی پیڑ لگے ہوئے تھے، جو دھوپ سے جل کر پژمردہ ہو گئے تھے۔ سرکار نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے خادم خاص صوفی شاہ وراست حسین کو حکم دیا کہ مکئی کے یہ پودے سوکھ گئے۔ ان کی جڑوں میں پانی ڈال دو۔ سرکار کے حکم کے مطابق انہوں نے لوٹا بھر پانی ڈال دیا۔

راوی کہتا ہے کہ ابھی وہ برہمن بیٹھا ہی تھا کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد پچھم کی طرف سے کالی گھٹاؤں کا بادل نمودار ہوا اور دم کے دم میں موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ چند گھنٹے میں سارا علاقہ جل تھل ہو گیا۔

سرکار قبلہ نے صوفی وراثت حسین کی طرف اشارہ کیا اور مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"دیکھو بابو! یہی پانی روکے ہوئے تھا۔ اس نے پانی کا دھار چھوڑا تو آسمان سے بھی موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اب اگر آئندہ بارش نہ ہو تو اس کے پاؤں میں رسی باندھ کر گھسیٹنا خوب پانی برسے گا۔"

اللہ اکبر! ذرا ناز بندگی تو دیکھئے...... خود کرتے ہیں لیکن الزام اپنے سر نہیں لیتے۔

مدفن کی خاک سے شفا

ضلع غازی پور کے رہنے والے تیغی سلسلے کے ایک مرید شاہ محمد طیب خاں اپنی سرگذشت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس وقت حضرت سرکار بقید حیات تھے، میرے بائیں پاؤں میں ایک ناسور ہو گیا۔ ہر چند علاج کرایا، وقت کے بڑے بڑے

ڈاکٹروں اور جراحوں کو دکھلایا، لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔

احباب کے اصرار پر جب بغرض علاج کلکتہ پہنچا تو یہاں کے تمام ڈاکٹروں نے لا علاج کہہ کر مجھے واپس کر دیا۔ ایک ڈاکٹر نے کہا کہ پاؤں کاٹنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ ایک ڈاکٹر نے تو یہاں تک کہدیا کہ دو ماہ کے بعد تمہارا پاؤں ازخود کٹ کر گر جائے گا۔

اسی درمیان میں سرکار قبلہ کے وصال جانگداز کی خبر موصول ہوئی، جس نے میری رہی سہی امیدوں کا خاتمہ کر دیا۔ عرس چہلم میں شرکت کے لیے میں اپنا زخمی پاؤں لیے سرکار کے آستانے پر حاضر ہوا۔ رات کو نظر بچا کر کسی طرح مزار مبارک کی خاک حاصل کی اور اسے ہمراہ لے کر اپنے وطن واپس آ گیا۔ جذبۂ عقیدت کی رہبری میں اس خاک کو پانی میں گھول کر میں نے اپنے زخم پر لگانا شروع کیا۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ چند دنوں میں میرا زخم بھرنا شروع ہوا یہاں تک کہ میں بالکل صحت یاب ہو گیا۔

اب کلکتہ پہنچ کر جو میں نے ڈاکٹروں کو بتایا تو حیرت سے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انہیں اقرار کرنا پڑا کہ ایک باخدا درویش کے آستانے پر وہ سب کچھ مل سکتا ہے جس کا حاصل کرنا دنیا کے لیے ناممکن ہو۔

زبان کی تلوار

حضرت شیخ المشائخ نے اپنے عہد ریاضت ومجاہدات کا یہ واقعہ خود بیان فرمایا ہے کہ ایک بار پیرومرشد حضرت شاہ مولا علی رحمۃ اللہ علیہ سخت بخار میں مبتلا ہوئے۔ حکیم کے مشورے سے میں انہیں روغن احمر کی مالش کر رہا تھا کہ اسی اثناء میں ایک شخص حیران و پریشان افتاں وخیزاں سرکار کی خدمت میں حاضر ہوا اور زاروقطار رونا شروع کر دیا۔ حضرت نے فرمایا کہ میں اس وقت بخار میں مبتلا ہوں جو کچھ کہنا ہے ان سے کہہ دو، یہ تمہارا

کام کردیں گے۔ حسب حکم میں اسے اپنے ہمراہ کنارے لے گیا اور اس سے حالات دریافت کیے۔ اس نے روتے ہوئے کہا کہ:

" میں گیا ضلع کے جس دیہات کا رہنے والا ہوں، وہاں بہت بڑا ظالم قسم کا ایک زمیندار ہے جو دن رات مجھے اور میرے بچوں کو ستاتا رہتا ہے۔ میری فصل کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔ وہ کلکتہ آیا ہوا ہے اور پتہ چلا ہے کہ وہ آج گھر جارہا ہے اور وہاں پہنچ کر وہ میرے مکان میں آگ لگادے گا۔ "

یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ حضرت سرکار فرماتے ہیں کہ اس کی فریاد سن کر اچانک میری زبان سے یہ جملہ نکل گیا:

" اطمینان رکھو، وہ گھر نہیں پہنچ سکے گا۔ "

فرماتے ہیں کہ ایک ہفتہ کے بعد وہ شخص پھر آیا اور میرے قدموں پر گر گیا اور کہنے لگا:

" حضور نے جیسا فرمایا تھا ویسا ہی ہوا۔ وہ گھر نہیں پہنچ سکا۔ راستے میں ٹرین سے گر کر مر گیا۔ اسی لیے میں شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ "

الاماں! تیغ علی کی کاٹ تو مشہور ہی تھی، تیغ کی زبان کی کاٹ سے بھی بچنا مشکل ہو گیا۔

ملفوظات

عرفائے کاملین کے قلوب پر لطائف والہامات کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ عالم قدس کے انوار سے متکیف ہوتے ہیں، جن سے دل کی گرہیں کھلتی ہیں اور حقائق کے چہرے سے نقاب اٹھتا ہے۔

حضرت شیخ المشائخ کے جو ملفوظات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں، ان سے

حضرت کی روحانی بصیرت اور معلومات کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔

توکل کسے کہتے ہیں

ایک مجلس میں توکل کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اپنے جمیع حرکات وسکنات کو خدا کے سپرد کردینے کا نام توکل ہے اور یہ ایمان کی شرط ہے۔قرآن مجید میں رب کریم ارشاد فرماتا ہے:

﴿ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾

ترجمہ: خدا پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان والے ہو۔

سعادت کے مقامات

ایک دن بعد نماز فجر ارشاد فرمایا کہ جب تک نفس مردہ نہ ہو دل زندہ نہیں ہوسکتا۔صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ سب سے بہتر پانچ آدمی ہیں۔

ایک وہ زاہد جو عالم ہو......دوسرا وہ صوفی جو فقیہ ہو.........تیسرا وہ دولت مند جو متواضع ہو.......... چوتھا وہ درویش جو صابر وشاکر ہو........ پانچواں وہ مؤمن جو اہل سنت وجماعت پر عامل ہو۔

روحانی انقباض کے دفع کا طریقہ

فرمایا جب ''قبض'' وارد ہو تو غسل ووضو کرکے دو رکعت نماز نفل ادا کرے اور قلب کی طرف متوجہ ہو کر گریہ وزاری کے ساتھ خدا سے دعا مانگے۔تین روز تک برابر یہ عمل کرے انشاء اللہ ''قبض'' دفع ہو جائے گا۔

دوسری ترکیب یہ ہے کہ تین مرتبہ درود شریف پڑھ کر داہنے ہاتھ پر دم کرے اور

اپنے سینے پر مل لے۔

اس ضمن میں آپ نے مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ طالب کو "ظلمت" اور "قبض" میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔ ظلمت روحانی معاصی کے ارتکاب سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ بغیر توبہ کے دور نہیں ہوسکتی۔

برکت نماز

ایک دن نماز کے موضوع پر گفتگو چل رہی تھی کہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص نماز کا پابند ہو جاتا ہے اور اسے ارکان و آداب کے ساتھ صحیح طور پر ادا کرتا ہے، ایک نہ ایک دن وہ ضرور نماز کی معنوی برکتوں سے فیضیاب ہوگا۔ اس کے دل میں معاصی سے نفرت پیدا ہو جائے گی اور اسے روحانی طہارت کا کیف حاصل ہوگا۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک انصاری نوجوان نماز پڑھتا تھا اور اس کے باوجود معاصی میں مبتلا تھا۔ بعض لوگوں نے سرکار کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شکایت کی۔ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی نماز کسی روز اس کو ان باتوں سے روک دے گی۔ چنانچہ کچھ ہی دنوں کے بعد وہ بری عادتوں سے تائب ہو گیا اور اس کی حالت باطنی قابل رشک ہوگئی۔

عرفان کے جواہرات

ایک دن طبیعت نشاط پر تھی۔ اپنے پروانوں کے دامن میں حقائق کے موتی انڈیل دیئے۔ فرمایا کہ بزرگوں کی طرف سے جو نعمتیں ملتی ہیں، ان کی قدر کرنی چاہیے۔ نعمت کا غرور اور بزرگی کی نخوت اس راہ کی سب سے بڑی ہلاکت ہے۔ طالب کے لیے ہر حال میں شریعت کی پابندی نہایت ضروری ہے۔ اپنے اندر ذوق وشوق اور توجہ الی اللہ کے

لیے خدا سے ہمیشہ دعا مانگنی چاہیے۔ عاجزی اور انکساری اس راہ کا بہترین رہبر ہے۔ فرمایا کہ انکسار و تواضع ہی کی تعلیم مطلوب تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ کو خطاب کیا گیا کہ:

﴿ قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ .... ﴾

جس کو بے دینوں اور عقل کے اندھوں نے کچھ کا کچھ سمجھ لیا اور کہنے لگے کہ معاذ اللہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرح بشر ہیں۔

خصائل وشمائل

حضرت شیخ المشائخ رحمۃ اللہ علیہ بچپن ہی سے حد درجہ راستباز، متواضع اور قناعت پسند تھے۔ دوست تو دوست دشمن بھی ساری زندگی آپ کے اخلاق کریمانہ سے شرمندہ رہے۔ ارباب حاجات اور مصیبت زدوں کے لیے ہر وقت آپ کے کرم کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ غرباء اور مساکین کو ہمیشہ سینے سے لگائے رہتے تھے۔ بیماروں کی عیادت، یتیموں کی دلجوئی اور بیواؤں کی خدمت آپ کی زندگی کا بہترین معمول تھا۔ اپنی بزرگانہ شوکت اور عرفان وتقویٰ کے شکوہ کا کبھی اظہار نہیں فرماتے۔ سادگی اور مسکنت جسم کے پیراہن کی طرح زندگی کے ساتھ رہی۔

علمائے اہل سنت کے اعزاز اور اکابرین کی توقیر وتکریم میں کبھی اپنی ذاتی عظمت کو حائل نہیں ہونے دیا۔ آپ کے قائم کردہ دارالعلوم کا سالانہ اجلاس ہمیشہ آپ ہی کی صدارت میں منعقد ہوتا تھا، لیکن از راہ احترام علماء مسند صدارت سے نیچے بیٹھتے تھے۔

سفر وحضر میں اپنے جملہ نیاز مندوں کا خاص خیال رکھتے۔ لغزشوں پر نہایت شفقت ونرمی کے ساتھ اشارے کنائے میں تنبیہ فرماتے۔

سرکار غوث اعظم رضی اللہ عنہ سے حد درجہ عقیدت تھی۔ گیارہویں شریف نہایت

تزک واحتشام سے کرتے تھے۔ آپ کا دسترخوان نہایت وسیع تھا۔ ہمیشہ مہمانوں کی آمد ورفت رہتی۔

معمولات یومیہ

مغرب کی نماز باجماعت کے بعد کھانا تناول فرماتے، پھر دس بجے رات تک حلقہ ہوتا۔ اس کے بعد یہ مجلس فاتحہ پر ختم ہوجاتی۔ تھوڑے وقفہ کے بعد عشاء کی نماز ادا کی جاتی اور پھر ۱۲ بجے شب تک پند ونصیحت، تعلیم وتلقین اور کتابوں کی خواندگی کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس کے بعد سوجاتے۔ پھر دوڈھائی بجے بیدار ہوتے اور نماز تہجد کے بعد اذکار واشغال میں مصروف ہوجاتے یہاں تک کہ سپیدۂ سحر نمودار ہوجاتا اور نماز فجر ادا فرماتے۔ نماز سے فارغ ہوکر مریدین ومسترشدین کو اذکار واشغال، سلوک وتصوف کی تعلیم مرحمت فرماتے۔ پھر فاتحہ خوانی وشجرہ خوانی پر یہ مجلس ختم ہوجاتی۔ اس کے بعد نماز چاشت واشراق سے فارغ ہوکر مسجد سے باہر تشریف لاتے اور اندر حویلی میں جاکر والدہ ماجدہ کی زیارت کرتے۔ ۱۱ بجے دن کو قرآن مجید کی تلاوت فرماتے۔ ۱۲ بجے سے آرام کرتے۔ ایک بجے اٹھ کر غسل فرماتے اور نماز ظہر ادا کرتے۔ پھر حاضرین کے ساتھ کھانا تناول فرماتے اور کھانے کے بعد تھوڑی دیر قیلولہ کرتے۔ عصر کی نماز کے بعد حزب البحر شریف تلاوت کرتے۔ پھر ایک گھنٹہ کھلی فضا میں چہل قدمی فرماتے۔

آپ کا سراپا

چہرہ مبارک روشن اور باوقار......سر مبارک متوسط......آنکھیں سرگیں...ناک سڈول اور قدرے ابھری ہوئی......دہن مبارک متوسط......دندان مبارک چھوٹے اور موتی کی طرح چمکدار......رخسار مبارک پر کئی تل......لبہائے شریف نہ زیادہ موٹے نہ

زیادہ باریک...... ریش مبارک گھنی...... سینہ متوسط...... گردن پر گوشت...... بدن گٹھا ہوا...... قامت زیبا...... رنگ گندمی اور چمکدار...... بھویں باریک...... پائے اقدس متوسط..... انگلیاں آپس میں ملی ہوئیں..... داہنے پاؤں کے تلوے میں جھنڈے کا نشان۔

کل تک اسی حسین وجمیل سراپا پر ایک دنیا شیدا تھی اور اب تصورات کے سہارے وہ اپنے چاہنے والوں کر درمیان زندہ ہیں۔

لباس ووضع

لباس میں سادگی بے حد پسند تھی۔ اکثر تہبند، گول مہری کا پاجامہ، لمبا کرتا اور اس پر صدری استعمال فرماتے، سر پر گول ٹوپی چنن دار اور اس پر عربی رومال کا عمامہ باندھا کرتے تھے۔ دوش مبارک پر سیاہ رومال پڑا رہتا۔ بادامی رنگ کا جوتا پسند تھا۔ دست مبارک میں عصا رکھتے۔ سردیوں میں ہمیشہ کمبل استعمال کرتے، لحاف یا دلائی کبھی نہیں اوڑھتے تھے۔

آخری لمحات

خاصان خدا کی روایات کے مطابق زندگی کا اکثر حصہ آزمائشوں اور سختیوں میں گذرا، لیکن انتہائی کرب وشدت کے عالم میں بھی معمولات وعبادات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلڈ پریشر کے مستقل مریض تھے۔ جب دورہ پڑتا تو متعدد امراض کا حملہ یکبارگی شروع ہوجاتا۔ حضرت کی عمر شریف جب ستر سال سے تجاوز کرگئی تو ضعف ونقاہت بہت زیادہ بڑھ گئی۔

زندگی کے آخری لمحات میں جب مرض کا شدید حملہ ہوا اور مقامی حکیموں کا علاج غیر مفید ثابت ہوا تو بغرض علاج داؤدنگر اور پٹنہ تشریف لے گئے، لیکن وہاں بھی کوئی افاقہ

نہیں ہوا۔ بالآخر رجب ۱۳۷۷ھ کے اخیر میں خانقاہ واپس تشریف لائے۔

یکم شعبان کو دامودر پور مدرسہ علیمیہ کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے۔ ۴؍شعبان کو خانقاہ واپس آئے۔ ۲۸؍شعبان پنجشنبہ کی شب میں حالت نہایت سنگین ہوگئی۔ نبض ڈوبنے لگی۔ نزع کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ فوراً آپ کو اتر دکھن لٹا دیا گیا۔ قبر شریف بھی تیار کرلی گئی۔ صبح ہوتے ہوتے سارے علاقے میں آپ کے وصال کی خبر مشتہر ہوگئی۔ ہر چہار سمت سے لوگوں کی آمد کا تانتا بندھ گیا۔ ادھر ڈاکٹروں نے موت کی تصدیق نہیں کی۔ چنانچہ تیسرے دن آنکھ کھل گئی اور زندگی کے آثار نظر آئے۔ ایک مہینے میں چلنے پھرنے کے قابل ہوگئے۔ حیرت انگیز صحت یابی سے لوگوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

چند ہی مہینے کے وقفے کے بعد پھر ربیع الاول شریف کے ابتدائی ایام میں مرض کا حملہ ہوا۔ مرض کی دردناک اذیت کا سلسلہ سارے مہینے جاری رہا۔ ۳۰؍ربیع الاول کی صبح سے حالت نہایت سنگین ہوگئی اور آواز بند ہوگئی۔ رفیق اعلیٰ کا مسافر محویت واستغراق کے عالم میں ڈوب گیا۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا، جہاں سے وہ گذر رہا تھا۔

بعد نماز مغرب جوں ہی گیارہوں شریف کا چاند نظر آیا.......اور سرکار غوثیت مآب کے فیضان معنوی کا دروازہ کھلا.........شاہ جیلاں کا سچا نیازمند اپنے آقا کی سنت پر قربان ہوگیا...... یک بیک حجرہ مبارکہ سے آواز آئی........سرکار دجلۂ نور کی لہروں میں ڈوب رہے ہیں........لوگ بے تحاشا دوڑے اور شمع انجمن کے اردگرد جمع ہوگئے.... بالآخر ایک ہچکی آئی.........اور یکم ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ شب چہار شنبہ بعد نماز مغرب ۶ بجکر ۳۵ منٹ پر کشور عشق وعرفان کا ایک تھکا ماندہ مسافر اپنی منزل عیش پر پہنچ گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

آہ! ایک بجلی چمکی.......خرمن جلا.......اور عشاق کا چمن تاراج ہوکے رہ گیا........وہ شمع گل ہوگئی جس کے سائے میں پروانوں کو بال وپر ملے تھے......سارے

علاقے میں قیامت کا کہرام بپا ہو گیا.......صبح ہوتے ہوتے سرکانہی شریف کے میدانوں میں سوگوار انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر لہرانے لگا........ بعد نماز ظہر غسل شریف کی تیاری شروع ہوئی .... درود وتہلیل کے سرمدی نغموں میں عالم جاوید کے مسافر کو کفن پہنایا گیا.........عطر کی بارش ہوئی ....رحمتوں کا مینہ برسا.......اور نسیم حجاز نے پیام شوق سنایا........ ۵ بجے نماز جنازہ پڑھی گئی اور غروب آفتاب سے پہلے پہلے آسمان ولایت کے خورشید کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

اس خبر کے پھیلتے ہی سارے ملک میں صف ماتم بچھ گئی۔ ایصال ثواب اور تعزیت کی ہزاروں مجلسیں منعقد ہوئیں۔ ویسے میکدے کا در اب بھی کھلا ہوا ہے، لیکن اب ساقی پس پردہ ہے۔ پلانے والا نظر نہیں آتا لیکن لذت کیف سے روح آج بھی سرشار ہو جاتی ہے۔ کل بادہ نوش ساقی کے روبرو بیٹھتے تھے آج مرقد پر بھیڑ لگتی ہے۔

سجادہ نشیں

چونکہ آپ کی کوئی اولاد باقی نہیں رہی جو آپ کے بعد خانقاہ وسجادگی کی وارث ونگراں ہوتی، اس لیے آپ نے اپنی حیات ہی میں اپنے خواہر زادہ حضرت صوفی شاہ محمد ابراہیم صاحب قبلہ دامت برکاتہم کو خرقۂ خلافت واجازت مرحمت فرما کر اپنا جانشین بنا دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ موصوف نے جانشینی کا صحیح حق ادا کیا اور ان تمام خصوصیات وروایات اور معمولات کو برقرار رکھا جو حضرت سرکار اقدس رضی اللہ عنہ سے انہیں وراثت میں ملی تھیں۔

اس وقت آپ کی ذات سے سلسلے کو جو فروغ حاصل ہو رہا ہے وہ محتاج ثبوت نہیں ہے۔ سرکار کی عظیم یادگار ''انوار العلوم علیمیہ'' آپ ہی کی سرپرستی میں پروان چڑھ رہا ہے۔ آپ کے محبوب خلیفہ صوفی شاہ قربان علی صاحب تیغی خانقاہ اور انوار العلوم کے استحکام

وترقی کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ پیش پیش ہیں۔

خلفاء

حضرت شیخ المشائخ نے اپنی زندگی میں بہتوں کو اپنے کمالات کا آئینہ بنا کر مسند خلافت مرحمت فرمائی اور انہیں باطنی اصلاح اور روحانی تطہیر کی خدمت پر مامور کر دیا۔ حضرت کے خلفاء میں بعض ایسی شخصیتیں بھی ہیں جن کا حلقۂ ارادت کئی صوبوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ان لوگوں میں سے حضرت مولانا صوفی شاہ محمد ایوب صاحب قادری تیغی کا نام نامی سرورق پر ہے۔

اجمالی طور پر خلفاء کی فہرست ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

حضرت صوفی شاہ محمد حنیف صاحب مظفر پور...... جناب مولوی شاہ عبد الرحیم صاحب مظفر پور...... جناب صوفی شاہ محمد اسرائیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ بنگلی...... جناب شاہ تبارک حسین صاحب مظفر پور...... جناب شاہ قربان علی صاحب چھپرہ...... جناب مولوی شاہ محمد خطاب صاحب مظفر پور...... جناب مولوی شاہ جناب علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ چمپارن...... جناب مولوی عبد الغفار صاحب بلیا...... جناب حافظ شاہ محمد ابراہیم صاحب مظفر پور...... جناب شاہ محمد عبد اللہ صاحب مظفر پور...... جناب شاہ محمد نبی بخش صاحب مظفر پور...... جناب محمد یوسف صاحب مظفر پور...... جناب شاہ عبد الغفور صاحب مظفر پور...... جناب صوفی شاہ وراست حسین صاحب مظفر پور...... جناب شاہ محمد صدیق صاحب مظفر پور...... جناب محمد سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ مظفر پور...... جناب صوفی شمس الدین خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ غازی پور...... جناب حافظ شاہ شمس الدین صاحب غازی پور...... جناب صوفی شاہ محمد ایوب صاحب غازی پور...... جناب محمد سعید صاحب مظفر پور...... جناب شاہ محمد غازی صاحب مظفر پور...... حضرت صوفی شاہ محمد ابراہیم صاحب قبلہ سجادہ نشیں مظفر پور...... جناب محمد قطب الدین صاحب مونگیر......

جناب ابوالحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مظفر پور........ جناب شاہ محمد اسحاق صاحب مظفر پور........ جناب محمد احمد کریم صاحب رحمۃ اللہ علیہ مظفر پور...... جناب شاہ عبدالحفیظ صاحب مظفر پور....... جناب محمد زین العابدین صاحب پٹنہ....... جناب محمد عباس خان صاحب اعظیم گڈھ....... جناب مولوی شاہ علاء الدین صاحب مظفر پور........ جناب محمد عبدالرحمٰن صاحب مظفر پور........ جناب محبوب عالم صاحب مظفر پور........ جناب محمد ادریس صاحب چھپرہ........ جناب شاہ محمد حنیف صاحب مشرقی پاکستان۔

اپنے مضمون کے آخری مرحلے پر یہ اعتراف کرتا ہوں کہ حضرت شیخ المشائخ محبوب الاولیاء شاہ محمد تیغ علی قدس سرہ العزیز کی زندگی کے بیشمار خدوخال نمایاں ہونے سے رہ گئے........ ہر ادا اپنی طرف کھینچ رہی ہے........ اور ہر نقش دعوت نظارہ دیتا ہے........ ایک پیکر جمال کو کہاں کہاں سے دیکھیں........ اور ایک مجسمہ حسن وخوبی کی کون کون سی بات بیان کریں۔

جیسا بھی ہے ادارہ جام نور کلکتہ کا یہ خراج عقیدت سرکار قبول فرمالیں تو آرزوؤں کی معراج ہو جائے کہ حضرت شیخ المشائخ، محبوب الاولیاء الحاج شاہ محمد تیغ علی صاحب قادری آبادانی قدس سرہ العزیز کے مداحوں کی صف میں کہیں بھی جگہ مل جانا زندگی کی بہت بڑی سعادت ہے۔

جمال یار کی زیبائیاں ادا نہ ہوئیں
ہزار کام لیا ہم نے خوش بیانی سے

۱۔ مندرجہ بالا مقالہ قائد اہل سنت نے "جام نور کلکتہ" کے خصوصی نمبر کے لیے تحریر فرمایا تھا۔ اب جب کہ اسے لکھے ہوئے تقریباً چالیس سال کا طویل عرصہ گذر چکا ہے، یقینی طور پر کئی قابل ذکر شخصیتیں وصال کر چکی ہوں گی اور حضرت شیخ المشائخ کے مشن کو مستحکم کرنے کے لیے بعض دوسرے جانثار میدان عمل میں رواں دواں ہوں گے۔

مرتب

شیر بیشۂ اہل سنت

حضرت علامہ حشمت علی رضی اللہ عنہ

کیوں رضا آج گلی سونی ہے
اٹھ میرے دھوم مچانے والے

شیر بیشۂ اہل سنت

ایک پیکر وفا

کیوں رضا آج گلی سونی ہے
اٹھ میرے دھوم مچانے والے

آہ.......... کہ نصف صدی تک دنیائے سنیت کو جگا جگا کر ایک دن سرکار مصطفیٰ کا نقیب خاموش ہو گیا۔

معتمد راویوں کا بیان ہے کہ اعلیٰ حضرت سیدنا امام احمد رضا فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز کی بزم عشق میں پہنچنے کے بعد ایک دن کائنات کا یہ مخفی راز اس کے دل پر آشکار ہو گیا کہ عرش و فرش کی وسعتوں میں رضائے الٰہی کی کلید خوشنودیٔ مزاج مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اس دن سے لے کر پیکر اجل کی آمد تک ایک وارفتہ حال دیوانے کی طرح ساری عمر وہ اسی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ شوق و طلب کی ایک بیتاب امنگ تھی جو رگ و پے میں خون کی لہروں کے ساتھ دوڑتی رہی اور عشق و اخلاص کا ایک دائم و قائم خمار

تھا، جس نے ساری عمر عقل و ہوش کی دنیا پر فرماں روائی کی۔ عشق و اخلاص کا خمار اس وقت بھی شریک سفر تھا جب کہ سر بالیں وصال کا سفرنامہ پیک اجل لیے کھڑا تھا اور نگاہوں کی بینائی محبوب کی تجلیوں میں ڈوب رہی تھی اور بلاشبہ وہی رفیق عزیز لحد کی خوابگاہ میں آج بھی شریک بزم تنہائی ہے۔

عشق کے داغ سے مانوس رہا کرتا ہوں
ویسے کہنے کو شب قبر کی تنہائی ہے

اس پیکر وفا کے سامنے دنیائے رنگ و بو میں ہزاروں انقلاب آئے ....حوادث کی مصلحتوں نے خوشامدیں کیں ....وقت کے تقاضوں نے دامن تھامے ....طوفانوں نے الارم دیا........قہر و جبر نے تازیانے اٹھائے ....ننگ و ناموس نے اندیشہ دلایا........اور یہ فتنۂ آشوب دنیا بارہا بن سنور کر آئی کہ ایک برہم دیوانے کا مزاج بدل دیا جائے........لیکن رات کے روشن سیارے اور دن کے چمکتے ذرے شاہد ہیں کہ وقت کے جبری تقاضوں پر دنیا کی ہر شئی بدل گئی ....دریاؤں کے بہتے ہوئے دھارے نشیب پا کر مخالف سمت پر لڑھک گئے ....انگاروں کی دھمک سے فولاد کا جگر پانی ہوگیا........ بارہا ایسا ہوا کہ مصلحتوں نے سرگوشی کی اور اچانک ہزاروں آتش نوا خطیبوں کی زبان گنگ ہوگئی اور قلم نے سپر ڈال دیے ....اور ایسا بھی ہوا کہ علم و تقویٰ کی مغرور پیشانیاں وقت کی مسند اقتدار کے آگے غبار آلود ہوگئیں........ مصلحت کی آتش سے نشیمن جلے........عشق کی آبرو لٹی........کفر نے امان پائی اور اسلام اسیر بلا ہوا........لیکن اپنے دور کا ایک وارفتہ جگر مجاہد تھا جس نے حالات سے دو بدو کرنا قبول کرلیا مگر غیرت وفا کی قربانی دے کر کسی طرح کی مصالحت کے لیے راضی

نہیں ہوسکا۔ وہ حق و باطل کے امتیاز میں کسی درمیانی راہ کا قائل نہ تھا۔ اس کی پوری زندگی اسی نظریہ کی عملی تفسیر تھی۔ ایک دامن کی پناہ حاصل کرنے کے لیے انتہائی بیدردی کے ساتھ اس نے لاکھوں دامن جھٹک دیے اور ایک چوکھٹ پر بستر جمایا تو سارے چوکھٹوں سے منہ موڑ کر گزر گیا۔

حق جب بھی مظلوم نظر آیا اس کی غیرت کا جلال برہم ہو گیا اور اس کے لب و لہجے کے خروش پر دریاؤں کی طغیانی ابھر آئی۔ اور جس حال میں بھی ہوا بغیر کسی لمحۂ انتظار کے حق کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

مشاہدات و محسوسات سے کہیں زیادہ اسے اس معنوی حقیقت پر یقین تھا کہ سرکار مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے کٹ جانے کے بعد زمین و آسمان کی وسعتوں میں کہیں امان نہیں مل سکتی۔ وہ ہر وقت اسی یقین کے اجالے میں رہتا تھا۔

اس کی حیات کے وہ لمحے انتہائی قابل رشک ہوتے تھے، جب وہ عاشقوں کی انجمن میں ہوتا اور داستان عشق و ایمان کا کوئی ورق الٹ کر وہ اپنے محبوب کائنات کی یکتائی اور جلالت شان کے خطبے پڑھتا...... اور اس وقت ساری فضا کیف و خمار سے معمور ہو جاتی اور فرط شوق میں کائنات کا دل جھومنے لگتا۔

اس کی خداداد شان خطابت میں مخلص کا ولولہ..... دل مبتلا کا سوز......... گھائل کی کراہ...... عشق کی چوٹ...... فداکار کی سرفروشی..... دیوانے کا استغناء...... مجاہد کا تیور..... انتقام کا جوش..... نیاز مند کا ادب..... اور ایک وارفتہ حال مومن کا ایمان جھلکتا تھا۔

حرمت عشق کے خلاف زبان و قلم کی کوئی ناپاک جسارت اس کے لیے کائنات کی سب سے بڑی اذیت تھی، جس کی تاب ضبط سے اس کا ضمیر ہمیشہ نا آشنا رہا۔ وہ اپنے کریم و جمیل آقا کا ایسا سرشار دیوانہ تھا کہ دنیا میں کسی سے اس کی شناسائی نہیں، بس ایک ہی

چہرہ اس کے قلب وجگر کا محبوب تھا اور جہاں جہاں بھی دل رکا وہی ایک محبت درمیان میں نسبت رابطہ تھی۔ ذاتی طور پر نہ اس کی کسی سے دشمنی تھی اور نہ دوستی ....وہ اپنے حبیب کے دوستوں کا دوست تھا اور دشمنوں کا دشمن اور یہ اس کے ایمان کا مزاج بن چکا تھا۔

بیگانوں کے سامنے اس کی پیشانی ہمیشہ مغرور نظر آئی لیکن غبار راہ میں بھی پائے حبیب کی کوئی سنت مل گئی تو سجدۂ شوق کے لیے دل کی پوری کائنات جھک پڑی۔

اس کے محبوب آقا کی حرمت پر جس نے بھی حرف رکھنا چاہا اس کے خلاف اعلان جنگ کرنے میں اس کے یہاں کوئی لمحۂ انتظار نہ تھا اور نہ غلبہ وقوت کا کوئی قہر اور مروت وشناسائی کا کوئی عاطفہ اس کی راہ میں حائل ہوسکتا تھا۔

اس کا کام سن کر ایوان باطل میں زلزلے پڑ جاتے تھے اور اسی کے ساتھ اس کی ذات دنیائے سنیت کی ایک ایسی متاع بے بہا تھی کہ اس کے تذکرے سے ایمان والوں کے چہرے شاداب ہوجاتے تھے۔ اس کے قدموں کی آہٹ پر وفاداروں کی ایک دنیا دیوانہ وار سمٹ جاتی تھی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں کہ جس شان وارفتگی کے ساتھ حضور شیر بیشۂ اہل سنت نے اسلام کو داخلی فتنوں سے پاک کیا اس کی مثال دور حاضر میں نہیں ملتی۔ اور یہ بھی ایک امر مسلم ہے کہ اسلام کو جتنا اندر سے نقصان پہنچا ہے، باہر سے نہیں۔ صدر اول کا وہ فتنہ جس نے ایوان اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور آج تک اس کی دھمک محسوس ہوتی ہے، وہ اندر ہی سے برپا ہوا تھا۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ مرد مؤمن اپنے وقت کا بہت بڑا مجاہد ہے جو دین مصطفیٰ کو اندر سے پاک کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور بے مثال جرأت و پامردی کے ساتھ باطل کی بساط الٹ کر حق کو برتر و غالب کردیا۔

اسے بصیرت خداوندی ہی کا کرشمہ کہا جاسکتا ہے کہ فتنہ جنم بھی نہیں لینے پاتا تھا کہ

اپنے وقت کے اس عظیم الشان مصلح کی خارشگاف نگاہوں کا شکار ہو جاتا تھا۔ اب اس کی جگہ یا تو نامرادیوں کے مدفن میں ہوتی تھی یا ہمیشہ کے لیے اعتبار کی نگاہوں سے گرادیا جاتا۔

کہا جاتا ہے کہ اصلاح وتطہیر کے میدان میں حضور شیر بیشۂ اہل سنت کی سب سے بڑی حریف وہابیت ودیوبندیت تھی، جن کے خلاف انہوں نے کبھی ہتھیار نہیں اتارے اور نہ ایک لمحہ کے لیے ان کا ذہن اس سے غافل رہا۔

جب کبھی بھی اور جہاں کہیں بھی زبان وقلم کو جنبش ہوئی رد وہابیت ودیوبندیت کا فرض قضا نہ ہو سکا اور اس کے لیے نہ کسی تقریب وتمہید کی ضرورت تھی اور نہ تحریک وآمادگی کا انتظار تھا کہ دعوت حق کے لیے فضا سازگار ہو اور جان ومال کی مضرتوں کا کھٹکا دور ہو جائے۔

بلاشبہ جذبۂ حق کا یہ خروش اور غیرت ایمانی کا یہ بے نیاز ولولہ انہی کے ساتھ مخصوص تھا۔ دین میں انہوں نے دیوبندیت ووہابیت کی رنگے ہاتھوں چوری پکڑی تھی اور اسلام کا لبادہ اوڑھ کر ناموس مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف منافقین کا کردار دہراتے ہوئے دیکھا تھا اور دیوبندی پیشواؤں کی کتابوں میں انہوں نے شان رسالت میں وہ توہین آمیز عبارتیں بھی پڑھیں جن کے تصور سے مؤمن کا دل کانپ جاتا ہے۔

حق نے جب کبھی اسے آواز دی وہ بغیر کسی لمحۂ انتظار کے اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ خلعت فاخرہ اسی کی قامت زیبا پر راس آئی۔ اس کی سطوت علم کے آگے بڑے سے بڑے طاغوت کی زبانیں خشک ہو جاتی تھیں اور اس کا نام سن کر باطل کے ایوان میں زلزلے پڑ جاتے تھے۔ پھر اس کے ساتھ اس کی عالمگیر محبوبیت کا یہ اقبال تھا کہ اس کے تذکرے سے مؤمنین کے دلوں کی کلی کھل جاتی تھی اور چہرے شاداب ہو جاتے تھے۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

صداقت وانصاف کا خون کر کے کوئی اعتراف حق سے پھر جائے تو اور بات ہے، لیکن یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ حضرت شیر بیشۂ اہل سنت نے جس صبر آزما حوصلوں کے ساتھ اسلام کو داخلی فتنوں سے پاک کیا، اس کی مثال دور حاضر میں نہیں ملتی۔

دراصل اس جذبے کے پیچھے ایک نہایت سنگین والمناک حادثے کی تاریخ تھی، جس نے اہل سنت کے قلوب کو ایسا گھائل کیا کہ وہ آج تک اچھے نہیں ہو سکے۔ وہ یہ ہے کہ ایک مسلمان بڑے سے بڑے زخم کی چوٹ برداشت کر سکتا ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ جان سے زیادہ عزیز پیغمبر کے ناموس کو کوئی بدبخت اپنی زبان وقلم کا نشانہ بنائے۔

زمانہ اس کے اس جذبۂ شوق کا ہمیشہ گلہ مند رہا کہ توہین وفا کے مجرم کو عالمگیر شہرت واثر کے حصار میں بھی اس کی زبان وقلم کے عبرتناک تازیانوں سے امان نہ مل سکی۔

فکر واعتقاد کے ملحدین نے ہمیشہ اس کے موقف کا مذاق اڑایا......... اس کی افتاد طبع سے بیزاری کا اعلان کیا....... اور جب زبان وقلم کے حربوں سے کام نہ نکلا تو طاغوت کی قوتوں کا سہارا لے کر فرعون وشداد کی تاریخ دہرائی.......... لیکن مایوس ومرعوب ہونا تو بڑی بات ہے، اس کے محکم یقین کی آب وتاب اور چمک گئی اور اس کے باطل شکن عزم کا تیور اور نکھر گیا۔

بلاشبہ شیر بیشۂ اہل سنت کی زندگی ایسی کردار کی مرقع تھی جیسے معلوم ہوتا ہے کہ مشیت کی طرف سے وہ اسی عظیم خدمت پر مامور کیے گئے تھے۔

یہ مجھے نہیں معلوم ہو سکا کہ سب سے پہلے "شیر بیشۂ اہل سنت" کے خطاب سے کس نے اسے مخاطب کیا، لیکن بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ لغت میں یہ ترکیب اسی کے لیے وضع ہوئی تھی اور اسی پر ختم بھی ہوگئی۔

خدائے غفور رحیم اس کے مدفن کی خاک پر شام وسحر رحمت وانوار کی بارش برسائے اور نسیم طیبہ ہمیشہ اس کی خوابگاہ کو معطر رکھے۔

مجاہد ملت

علامہ حبیب الرحمن قدس سرہ

دیار نجد سے لوٹا تو سرخرو لوٹا
بچا کے اپنی جماعت کی آبرو لوٹا

احمد کمالؔ جمشید پوری مرحوم

مجاہد ملت

ایک عہد ساز شخصیت

حضرت مولانا مدثر حسین حبیبی کے ایک خط سے یہ معلوم کر کے مجھے بے پایاں مسرت حاصل ہوئی کہ وہ نوائے حبیب کا مجاہد ملت نمبر شائع کر رہے ہیں اور کاپیاں پریس میں طباعت کے لیے جا رہی ہیں۔ کاش مجھے وقت ملتا تو میں بھی حضرت مجاہد ملت کی حیات طیبہ کے کسی گوشہ پر اپنے قلم کا خراج پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا۔

اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ میں نے حضرت مجاہد ملت کی خدمت میں گذارا ہے۔ سفر و حضر میں ان کی ہمرکابی کا بارہا شرف حاصل ہوا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ بارہ مناظروں میں ان کے ساتھ میں نے سفر کی سعادت حاصل کی ہے، جن میں سے آٹھ مقامات پر میں نے حضور مجاہد ملت کی

صدارت میں کامیاب مناظرہ کیا ہے۔ یہ بالکل امر واقعہ ہے کہ مناظرہ کے اصول ورموز، بحث واستدلال کے ضابطے اور گفتگو کے قواعد وآداب کا جو سرمایہ بھی میرے پاس ہے، وہ حضور مجاہد ملت ہی کا عطا کردہ ہے۔ دو چار دن کا بھی مجھے وقفہ ملتا تو میں چند مناظروں میں حضرت مجاہد ملت کی علمی اور فنی عقدہ کشائی کے بصیرت افروز حقائق سے اہل سنت کے عوام وخواص کو باخبر کرتا۔ فی الحال اس نمبر کے ذریعہ عامہ مسلمین اہل سنت تک یہ پیغام ضرور پہنچا دینا چاہتا ہوں کہ اگر اللہ نے چاہا تو مستقبل قریب میں حضرت مجاہد ملت علیہ الرحمہ کی مبارک زندگی کے اس گوشے پر ایک طویل مضمون یقیناً شائع کروں گا۔

حضرت مولانا مدثر حسین حبیبی بہرحال مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے مجاہد ملت کی حیات طیبہ پر ایک ضخیم اور قیمتی دستاویز مسلمانان اہل سنت کے ہاتھوں میں پہنچا کر جماعت کی اہم ضرورت پوری کردی ہے........ بلکہ مجاہد ملت کی حیات طیبہ پر لکھنے والوں کے لیے ایک علمی اور تاریخی ماخذ مہیا کردیا ہے۔

مالک قدیر اس نمبر کو قبولیت عام کا اعزاز مرحمت فرمائے اور حضور مجاہد ملت کے نقوش قدم پر ہمیں چلنے کی توفیق عطا کرے۔ آمین

حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرۂ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلآویز اردو ترجمہ

ادارہ ضیاء المصنفین

بھیرہ شریف کی زیر نگرانی

مرکزی دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

تفسیر در منثور 6 جلد

زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکی ہے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور

کتابِ رشد وہدایت کی ہمہ گیر آفاقی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے

نور وسرور اور جذبہ حب رسول ﷺ پر مبنی آیات احکام کی مفصل وضاحت

اردو زبان میں پہلی مرتبہ

تفسیر احکام القرآن

مفسر قرآن، علامہ مفتی محمد جلال الدین قادری

آیات احکام کا مفصل لغوی وتفسیری حل امہات کتب تفسیر کی روشنی میں

مفسرین کی تصریحات کے مطابق پیش کیا گیا۔

اس لئے یہ کتاب طلباء، علماء، وکلاء، ججز

اور عوام وخواص کے لئے قیمتی سرمایہ

آج ہی طلب فرمائیں

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی۔ پاکستان

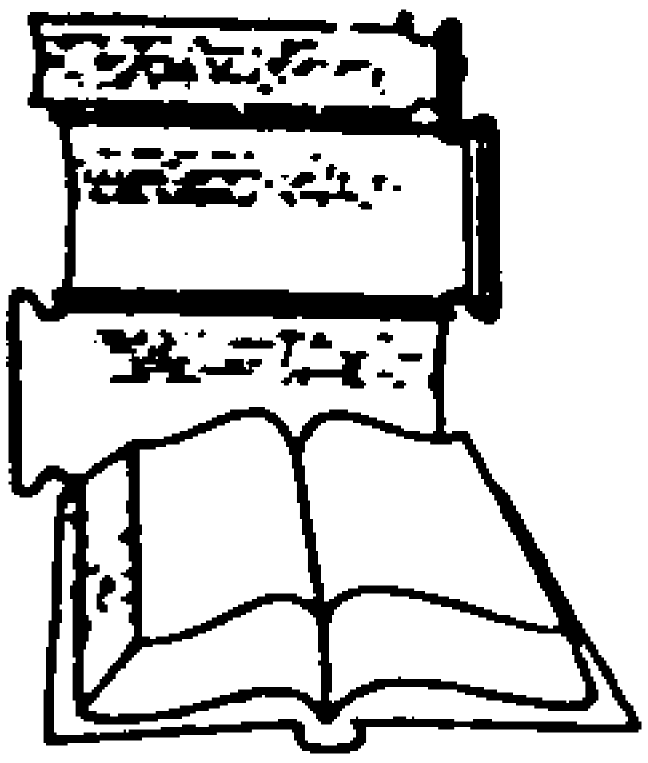

اہل علم کیلئے
عظیم علمی پیشکش

آیات احکام کی تفسیر و تشریح پر مشتمل عصر حاضر کے یگانہ روزگار اور معتبر عالم دین

حضرت علامہ سیّد سعادت علی قادری کے

قلم سے نکلا ہوا عظیم علمی شاہکار

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

۲ جلدیں

خصوصیات

- زندگی کے تمام شعبوں اور عصر حاضر کے جملہ مسائل کا حل
- متلاشیان علم کے لئے ایک بہترین علمی ذخیرہ
- مقررین، واعظین کیلئے بیش قیمت خزانہ
- ہر گھر کی ضرورت اور ہر فرد کیلئے یکساں مفید

آج ہی طلب فرمائیں

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

خوشخبری

معروف محدث و مفسر حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کا عظیم شاہکار

تفسیر مظہری 10 جلد

جس کا جدید، عام فہم، سلیس اور مکمل اردو ترجمہ ''ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف''

نے اپنے نامور فضلاء جناب الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان صاحب

جناب الاستاذ سید محمد اقبال شاہ صاحب اور جناب الاستاذ محمد انور مگھالوی صاحب

سے اپنی نگرانی میں کروایا ہے۔ چھپ کر منظر عام پر آچکی ہے۔ آج ہی طلب فرمائیں

ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، کراچی۔ پاکستان

فون:۔ 7220479- 042-7221953 فیکس:۔ 042-7238010

042-7247350-7225085

021-2212011-2630411